جنوبی پنجاب کا مجوزہ ترقیاتی منشور

دسمبر 2021

FRIEDRICH EBERT STIFTUNG
فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ

جنوبی پنجاب کا مجوزہ
ترقیاتی منشور

دسمبر 2021

اشاعت:
کاپی رائٹ 2021، فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ پاکستان آفس
فرسٹ فلور، W-66، جنید پلازہ، جناح ایونیو، بلیو ایریا، پی او بکس
1289، اسلام آباد، پاکستان

ذمہ داران:
ڈاکٹر یوخن ہپلر | کنٹری ڈائریکٹر
عبداللہ دایو | پروگرام کوآرڈینیٹر

تصویر:
کاپی رائٹ: یوخن ہپلر

فون: 4 – 3391 280 51 92+
فیکس: 2803395 51 92+
ویب سائٹ: http://www.pakistan.fes.de
فیس بک: Friedrich-Ebert-Stiftung, Pakistan
ٹویٹر: @FES_ PAK

ایف ای ایس کے زیر اہتمام شائع کردہ تمام مواد کا کمرشل بنیادوں پر استعمال ایف ای ایس کی تحریری رضامندی کے بغیر ممنوع ہے۔

ISBN: 978-969-9675-40-9

فہرست

پیش لفظ ---------- i

رحیم یار خان ---------- 1

ملتان ---------- 7

لیہ ---------- 13

لودھراں ---------- 19

ڈیرہ غازی خان ---------- 25

بہاولپور ---------- 31

بہاولنگر ---------- 36

راجن پور ---------- 43

مظفر گڑھ ---------- 50

وہاڑی ---------- 59

خانیوال ---------- 67

پیش لفظ

جنوبی پنجاب کے شہری نمائندوں کا تیار کردہ علاقائی اور عوامی ترقیاتی منشور آپ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ مختصر کتابچہ صرف چند صفحوں کی کتاب نہیں، بلکہ وسیب کے گیارہ اضلاع کے شہری نمائندوں کے اجتماعی شعور کا نتیجہ اور نچوڑ ہے۔ یہ وہ دستاویز نہیں جو میز پر کہیں بیٹھ کر بنائی گئی ہے؛ ان صفحات کے پیچھے تقریباً 30 کے قریب ان شہری نمائندوں کی گفتگو، زمینی حقائق، معلومات اور دانش موجود ہے جنہوں نے فریڈرک ایبرٹ سٹفٹنگ (ایف ای ایس) کے ساتھ قریباً 6 ہفتے مسلسل کام کیا تو تب کہیں جا کر اس کتابچہ کو حتمی شکل دی جا سکی۔ یہ کسی طور بھی یکطرفہ عمل نہ تھا بلکہ اک اک لفظ اور اک اک سطر پر ان شہری نمائندوں سے مشورہ اور رہنمائی حاصل کی گئی جو اس سارے عمل کا حصہ رہے۔

ان نمائندوں میں مقامی صحافی، مقامی سیاسی جماعتوں کے نمائندے، مذہبی واقلیتی رہنما، خواتین کے ساتھ غیر سرکاری تنظیموں کے عہدیداران بھی شامل تھے جو دو دن مسلسل اپنے اپنے اضلاع کے عوامی ترقیاتی مسائل پر شاندار گفتگو کی۔ ہمیں یہ کہنے میں ذرا سی بھی جھجھک نہیں کہ ان شہری نمائندوں نے اپنے اپنے اضلاع میں موجود مسائل پر عمدہ معلوماتی و پر مغز گفتگو اور تجزیے پیش کیے اور ساتھ ہی وہاں موجود اپنے لوگوں کی عمدہ بہترین نمائندگی کی۔

گفتگو کی اس نشست کے تمام شرکاء ہی اس بات پر متذبذب تھے کہ وسیب کو ہر الیکشنز سے قبل اک الگ صوبہ بنانے کی بات کی جاتی ہے، سیاسی اتحاد تشکیل دیئے جاتے ہیں، قومی سیاسی رہنما وسیب کے دورے کے دوران وعدے وعید کرتے ہیں، عوام کو ان کے مسائل کا "دروازے پر ہی حل" ہو جانے کا خواب دکھاتے ہیں، مگر الیکشن ہوتے ہی یہ تمام وعدے گویا ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ شہری نمائندوں نے اک دلچسپ زاویہ یہ سامنے رکھا کہ ایسے وعدے بھلے سیاستدان سیاست کے نام پر ہی کرتے ہوں، مگر ایسا کرنے سے عوام کا سیاستدانوں، سیاسی عمل اور آئین کے تحت حقوق حاصل کرنے کے تخیل پر کاری ضرب پڑتی ہے۔ اور یہ ضربیں اب اک بہت طویل عرصہ سے پڑ رہی ہیں۔

شہری نمائندوں کا بہت مخلصانہ خیال اور مشورہ یہ تھا کہ اس موضوع کو سیاست کا موضوع بھلے رہنے دیا جائے اور اس پر مثبت اقدامات بھی کیے جائیں، مگر قلیل المدتی سیاسی مقاصد کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ عوام کا سیاسی جمہوریت پر یقین رہنا اشد ضروری ہے۔

پنجاب آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ محکمہ بہبود آبادی پنجاب کی سنہ 2017 کی مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق پنجاب میں تقریباً گیارہ کروڑ ستر لاکھ افراد بستے ہیں۔ اس میں سے چار کروڑ آبادی شہری اور قصباتی ہے جب کہ سات کروڑ آبادی دیہاتی اور چھوٹے علاقوں میں رہتی ہے۔ صوبے میں مردوں کی شرح خواندگی 71 فیصد جب کہ خواتین کی شرح خواندگی 55 فیصد ہے۔ سال 2021-22 کے لیے پنجاب کا کُل سالانہ بجٹ 2 کھرب اور 65 ارب روپے رکھا گیا ہے اور اس میں سے ترقیاتی بجٹ کا تخمینہ 337 ارب روپے ہے۔ وسیب، جو کہ پاکستان کے آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑے صوبے کا سب سے بڑا جغرافیائی اور

آبادی والا حصہ ہے، کے لیے کل ترقیاتی بجٹ کا 34 فیصد رکھا گیا ہے جو تقریبا 189.22 ارب روپے بنتا ہے۔ وسیب کے 11 اضلاع پورے صوبہ پنجاب کا 52 فیصد علاقہ بناتے ہیں۔ وسیب کے شہری نمائندوں کا خیال ہے کہ اتنے بڑے علاقے کے لیے بجٹ میں ترقیاتی تخمینہ بھی اسی رقبے کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔

بینظیر انکم سپورٹ پروگرام میں غربت کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق، وسیب کے 11 میں سے 7 اضلاع شدید غربت کی لپیٹ میں ہیں اور پاکستان کی قومی ترقی کے اعشاریوں کے مطابق، چوٹی کے 15 اضلاع میں وسیب کے صرف 2 اضلاع موجود ہیں جب کہ ترقی کے انہی اعشاریوں کے حوالے سے پاکستان کے کم ترین ترقی یافتہ 15 اضلاع میں سے 8 اضلاع کا تعلق وسیب سے ہے۔

پاکستان اور پنجاب، دونوں کے تقابل میں وسیب کے ترقیاتی اعشاریے حوصلہ افزا نہیں ہیں اور وہاں کی عوام کا یہ حق ہے کہ انہیں بہتر زندگی کے مواقع فراہم ہوں۔ عین اسی سلسلہ میں ایف ای ایس نے خود شہری نمائندوں سے سیکھنے اور اس کتابچہ کے قارئین تک وسیب کے علاقے کے مسائل پہنچانے کے لیے لاہور میں اس علمی نشست اور گفتگو کا اہتمام کیا جس نے وہ عمل شروع کیا جس کا حتمی نتیجہ اس دستاویز کی صورت میں آپ کے ہاتھ میں موجود ہے۔

آخر میں ایف ای ایس، سینٹر فار سوشل ایجوکیشن اینڈ ڈیویلپمنٹ کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر، مبشر اکرم کا بھی شکر گزار ہے کہ انہوں نے اس نشست میں شرکت کی، شرکاء کے ساتھ ان کے مسائل پر گفت و شنید کر کے اور پھر بعد ازاں انہی شرکاء کی رہنمائی اور قائدانہ مدد سے اک مشترکہ طور پر اتفاق کردہ عوامی ترقیاتی منشور تشکیل دیا۔ یہ ایف ای ایس کا بہت پختہ یقین ہے کہ ترقی، بہتری اور جمہوریت کے فروغ کے لیے باہمی مشاورت کی اہمیت سے انکار کسی طور بھی ممکن نہیں، اور اسی لیے اس نوعیت کی سرگرمیوں میں ہم کوشش کرتے ہیں کہ تمام مکتبہ فکر کے لوگ سامنے آئیں اور پاکستان میں جمہوریت اور ترقی سے وابستہ موضوعات پر کھل کر اپنی آراء کا اظہار کریں۔

ڈاکٹر یوخن ہپلر
کنٹری ڈائریکٹر
فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ، اسلام آباد

عبداللہ دایو
پروگرام کوآرڈینیٹر
فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ، اسلام آباد

دسمبر 2021

رحیم یار خان

تعارف

رحیم یار خان ایک گرم شہر ہے۔ یہاں کے لوگوں کی معیشت کا زیادہ تر انحصار زراعت پر ہے۔ یہاں پنجابی اور سرائیکی بولنے والے مقیم ہیں۔ جنوبی پنجاب میں ملتان کے بعد، یہ دوسرا بڑا صنعتی شہر ہے۔ یہاں ملکی اور غیر ملکی کاروباری اداروں کی بڑی صنعتوں کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کی فراہمی کے لیے میڈیکل کالج موجود ہے اور اس کے علاوہ زرعی کالج بھی ہے جو علاقہ کی آب وہوا کے مطابق زرعی تحقیق میں اک مقام رکھتا ہے۔

شیخ زید میڈیکل کالج متحدہ عرب امارات مہاعم شیخ زید بن سلطان النہیان کے مرحوم حکمران کے نام پر رکھا گیا ہے۔ کالج کو پاکستان میڈیکل اینڈ ڈینٹل کونسل کی طرف سے تسلیم شدہ ہے۔

اس شہر میں شکار گاہیں بھی ہیں۔ "صحرا محل" کے نام سے محل بھی ہے، جو متحدہ عرب امارات کے شاہی خاندان کی ملکیت ہے۔ یہاں شاہی خاندان کا اپنا ایئرپورٹ بھی ہے، اور ایئرپورٹ سے محل تک ایک وسیع اور کشادہ سڑک بھی ہے۔ یہاں عرب شہزادے شکار کے لیے آتے ہیں۔ ملک کے اندر سے پی آئی اے کی پروازیں بھی چلتی ہیں، گو کہ ان پروازوں کی تعداد بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ یہاں کاروباری سرگرمیوں کے علاوہ، سیر وسیاحت کو بھی فروغ مل سکے۔

زراعت میں گنا، کپاس اور گندم بڑی فصلیں ہیں۔

ضلع رحیم یار خان کی 1998ء کی مردم شماری کے مطابق، آبادی 3,141,053 نفوس پر مشتمل تھی۔ جبکہ 2017 کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 4,814,006 ریکارڈ کی گئی۔ اس ضلع کی آبادی تیزی سے بڑھی ہے۔ جس کی وجہ سے ضلع اور خود رحیم یار خان شہر کا انفراسٹرکچر اس بڑھتی ہوئی آبادی کا بوجھ اٹھانے سے قاصر نظر آتا ہے۔ روایتی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں اگر محکمہ بہبود آبادی کو مزید فعال بنایا جائے تو یہاں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلہ پر قابو پانے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مقامی سطح پر بڑھتی آبادی کے نقصانات سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے اور بالخصوص چھوٹی عمر کی شادیوں پر قانون کے مطابق مکمل پابندی لگائی جائے۔

رحیم یار خان میں قومی اسمبلی کے 6 حلقے ہیں۔ این اے 175 تا 180، جب کہ صوبائی اسمبلی کے 13 حلقے ہیں۔ پی پی 255 تا 267۔

رحیم یار خان کے سیاسی خاندان

چوہدری جعفر اقبال گجر سابق ڈپٹی سپیکر قومی اسمبلی اور سابق سینیٹر تھے اور ان کی اہلیہ بیگم عشرت اشرف خصوصی نشست پر ایم این اے تھیں۔ ان کا بیٹا عمر جعفر 2013 میں ایم پی اے اور بیٹی زیب جعفر خصوصی نشست پر ایم این اے تھیں۔ (جعفر کی بھانجی مائزہ حمید گجر 2013 میں خصوصی نشست پر ایم این اے تھیں)

مخدوم سید احمد 2008 میں پنجاب کے گورنر تھے اور ان کے والد سید غلام میر اشاہ ریاست بہاولپور کے ایگزیکٹو ممبر تھے۔ احمد کے بیٹے مخدوم مصطفیٰ محمود بیٹھے ایم این اے اور مخدوم مرتضیٰ ایم این اے بیٹھے ہیں۔ احمد کے بھتیجے مخدوم عثمان محمود موجودہ ایم پی اے ہیں۔

مخدوم خسرو بختیار موجودہ وفاقی وزیر اور ان کے بھائی مخدوم ہاشم جواں بخت صوبائی وزیر ہیں۔ اس کا باپ میاں امتیاز 2013 میں ایم این اے تھے اور ان کے بھائی میاں اعجاز تحصیل ناظم تھے۔

جاوید اقبال وڑائچ موجودہ ایم این اے اور ان کے قریبی رشتہ دار چوہدری ظفر اقبال وڑائچ 2002 میں ایم این اے ہیں۔

سردار ارشد لغاری 2013 میں وفاقی وزیر تھے اور ان کے بھائی سردار اظہر خان لغاری ضلع کونسل کے ممبر تھے۔

رئیس نبیل ایم پی اے اور ان کے والد رئیس منیر احمد ضلع کے رکن 2002 میں وزیر مملکت تھے۔

احمد عالم انور 2002 میں وفاقی وزیر تھے اور ان کے بیٹے مخدوم مبین احمد عالم ایم این اے ہیں۔

مخدوم شہاب الدین 2008 میں وفاقی وزیر اور ان کے بھتیجے مخدوم محمد ارتضیٰ ہاشمی 2008 میں ایم پی اے تھے۔

زراعت کا مسئلہ

یہ ایک زرعی ضلع ہے اور زرخیز زمین ہونے کی وجہ سے یہاں ہر طرح کی فصل ہوتی ہے۔ مگر یہاں کی زراعت کو روایتی اور غیر روایتی انداز کے مسائل کا سامنا ہے جس میں زراعت کی اکثریت کا قدیم طریقوں پر ہی چلتے رہنا جبکہ زرعی ادویات کے معیار میں شکایات سب سے اوپر ہیں۔ گو کہ یہاں بڑے بااثر اور جاگیر دار خاندان بھی زراعت کے شعبہ سے منسلک ہیں، وہ مگر عموما چھوٹے کاشتکاروں کے مسائل میں اتنی دلچسپی لیتے نظر نہیں آتے۔

اک وجہ یہ بھی ہے کہ بااثر اور طاقتور خاندانوں سے تعلق ہونے کی وجہ سے ان کو ویسے مسائل کا سامنا ہی نہیں کرنا پڑتا جن سے چھوٹا کسان تقریباسارا سال نبرد آزمار ہتا ہے۔ پانی کے مسائل ہیں اور بالخصوص پانی کی تقسیم چھوٹے کاشتکاروں کے حق میں نہیں اور اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے محکمہ زراعت بھی اتنا فعال نظر نہیں آتا۔ ان مسائل کی وجہ سے چھوٹے کسان کی آمدن میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو پاتا اور ہزاروں چھوٹے کاشتکار مسلسل غربت اور قرضوں کے چکروں میں پھنسے رہتے ہیں۔

حال ہی میں پرائیویٹ ہاؤسنگ اداروں نے بھی ضلع بھر میں، بالخصوص رحیم یار خان شہر کے آس پاس زرعی زمینوں پر رہائشی منصوبے بناکر فروخت کرنا شروع کر دیئے ہیں۔ اس سے چند اک لوگوں یا کاروباری اداروں کو تو منافع ملتا ہو گا، مگر علاقے کی معیشت پر بہت کاری ضربیں بھی لگ رہی ہیں۔

یہاں کی زمینیں غیر مقامی افراد یا تو اونے پونے خرید لیتے ہیں، یا پھر ریٹائرڈ فوجیوں کو الاٹ کر دی جاتی ہیں۔ اس جاری شدہ سلسلے کی وجہ سے مقامی سماج میں بے چینی بڑھ رہی ہے اور ان معاملات میں دادرسی نہ ہونے کی وجہ سے لوگ غم وغصہ کا شکار بھی نظر آتے ہیں۔

حل

شہریوں کا خیال ہے کہ زرعی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں زراعت کو بھی باقاعدہ معیشت کی طرح سے دیکھا جانا چاہیے اور جیسے معیشت کے دوسرے شعبوں میں جدت کے لیے حکومتی کوششیں سامنے آتی رہتی ہیں، رحیم یار خان میں زراعت، بالخصوص چھوٹے کاشتکار کے لیے ویسی ہی حکومتی کوششیں سامنے آنی چاہئیں۔ حکومت کو چاہیے کہ چھوٹے کاشتکاروں کی تربیت کا بندوبست کرے اور انہیں جدید طریقہ کاشت سے آگاہی فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ آسان اقساط پر طویل المدت قرضے فراہم کرے اور محکمہ زراعت ان قرضوں سے ہر ممکن فائدہ اٹھانے کے لیے چھوٹے کاشتکاروں کی رہنمائی کرے۔

حکومت کو چھوٹے کاشتکاروں کے ساتھ منسلک کرنے کے حوالے سے ضروری ہے مقامی میڈیا، غیر سرکاری تنظیمیں اور خود چھوٹے کاشتکاروں کی اک تنظیم بناکر ضلعی اور صوبائی حکومت تک رسائی حاصل کی جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ یہ سماجی تحریک مثبت نتائج پیدا کرے۔ میڈیا کو چھوٹے کاشتکاروں کے مسائل مسلسل اجاگر کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔

رحیم یار خان کو پانی فراہم کرنے والی بڑی نہر، عباسیہ لنک کنال پر پانی کی چوری کی رپورٹیں مسلسل منظر عام پر آتی رہتی ہیں، اور اس چوری کا نقصان ہمیشہ چھوٹے کاشتکار کو ہی ہوتا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلسل چوری ہوتے ہوئے پانی کی شکایات پر قانون نافذ کرنے والے ادارے سنجیدہ غوروفکر کریں اور اس کا تدارک اس لیے بھی کریں کہ زراعت کے شعبہ میں چھوٹے کاشتکاروں کی بہت بڑی اکثریت ہے جن میں سے وہ جو Tail-Ends پر موجود ہیں، انہیں پانی کی فراہمی اکثر الاوقات ممکن نہیں ہو پاتی جس کی وجہ سے ان کا معاشی استحصال تو ہوتا ہی ہے، مقامی سطح پر جھگڑے بھی بڑھتے ہیں۔

نیز، نہروں اور کھالوں کی بھل صفائی وقت پر نہیں ہوتی جس کی وجہ سے پانی کا ضیاع مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ بڑے کاشتکار تو اپنے ذرائع کی وجہ سے اپنی کھالیں پختہ کروالیتے ہیں، مگر چھوٹے کاشتکار ایسا نہیں کرواسکتے تو جس کی وجہ سے ان کی پیداواریت میں کوئی مثبت اضافہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ بھل صفائی کو یقینی بنایا جانا چاہیے اور اس ضمن میں محض کاغذی کارروائی نہ کی جائے۔

شہریوں کا یہ بھی خیال ہے کہ علاقہ میں گنے اور کپاس کی کاشت کے علاقے مختص کیے جائیں، کیونکہ ضلع میں جہاں صاف پانی کی قلت ہے وہاں گنے کی کاشت نہ ہونے دے جائے۔ گنے کے چھوٹے کاشتکاروں کو یہ شکایت بھی رہتی ہے کہ مقامی شوگر ملز مالکان ان کے ساتھ شفافیت والا رویہ اختیار نہیں کرتے اور انہیں فصلوں کا معاوضہ کئی کئی برس ادا نہیں کیا جاتا۔ ان شکایات کا ازالہ کیا جانا چاہیے۔

ہاؤسنگ مافیاز کو زرعی زمینوں پر ہاؤسنگ سوسائٹیز نہ بنانے دی جائیں۔ اس سلسلہ میں ضلعی اور صوبائی سطح پر قانون سازی کی جانی چاہیے اور اس قانون کو سختی سے لاگو بھی کیا جانا چاہیے۔

جن علاقوں میں ریٹائرڈ فوجیوں کو زمینیں الاٹ کی جاتی ہیں، اس سلسلہ کو روکا جائے اور مقامی لوگوں کو زمینوں کی الاٹ منٹ کی جائے۔ بالخصوص ان زمینوں پر مقامی لوگوں کا حق پہلے تسلیم کیا جانا چاہیے جو ان زمینوں پر نسل در نسل آباد ہیں۔ انہیں ان کی آبائی جگہوں سے بے دخل نہیں کیا جانا چاہیے۔

انتہاپسندی اور بنیاد پرستی کے مسائل

جنوبی پنجاب کے چند دوسرے اضلاع کی طرح، یہ ضلع بھی مذہبی انتہاپسندی کی لپیٹ میں رہتا ہے جس کی وجہ سے یہاں کبھی کبھار تشدد بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ مسئلہ مذہبی تہواروں کے مواقع پر مزید ابھر کر سامنے آتا ہے اور ضلع بھر میں اک تناؤ کی سی کیفیت محسوس کی جاتی ہے۔ یہاں ہر فرقہ کے مذہبی مدارس اک بڑی تعداد میں موجود ہیں جنہیں باقی تعلیمی نظام کے ساتھ جوڑنے کی ضرورت ہے۔

حل

مذہبی انتہاپسندی کی روک تھام کے لیے جدید تعلیم کو فروغ دیا جانا چاہیے اور مدارس چونکہ اک سماجی وادارہ جاتی حقیت ہیں، تو ان کے ساتھ مل کر امن و آشتی کے تربیتی کورسز کا اجرا کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں غیر سرکاری تنظیمیں آگے آئیں اور مقامی میڈیا اور سیاسی جماعتوں کے ساتھ ساتھ مقامی عمائدین کے ساتھ مل کر مدارس اور ان کے رہنماؤں کے ساتھ اپنے روابط استوار کریں تاکہ مدارس کی کمیونیٹی بھی سماجی مسائل میں شرکت محسوس کرتے ہوئے سماج سدھار کے حوالے سے امن کو اپنے ذمہ داری جانے۔

اس بات کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے کہ مدارس میں، یا کسی بھی تعلیمی ادارے میں کسی بھی قسم کے کوئی انتہاپسند نظریات کا پرچار ہو۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی ذمہ داری مذہبی رہنماؤں کی ہے۔ غیر سرکاری تنظیموں کا فرض ہے کہ وہ مذہبی طبقہ کے مختلف مسالک کے مابین مذہبی رواداری کو فروغ دیں اور ان کے رہنماؤں کو اک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے کے مواقع فراہم کریں تاکہ ان کے اس اتفاق سے سماجی ہم آہنگی کی سوچ کو نمایاں کیا جاسکے۔

بیروزگاری یہاں کے پڑھے لکھے یا کم پڑھے لکھے نوجوان کا اک بڑا مسئلہ ہے۔ فراغت اور مایوسی میں نوجوان کسی عظیم تر مقصد کے لیے کوئی Meaningful Connection تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مدارس کے ساتھ جُڑت انہیں اپنے تئیں کا اک مقصد فراہم کرتی نظر آتی ہے۔ شہریوں کا خیال ہے کہ نوجوانوں کے لیے مقامی سطح پر روزگار کے مواقع پیدا کیے جائیں تاکہ وہ ہر قسم کی منفی اور پرتشدد سرگرمیوں سے چھٹکارہ حاصل کر سکیں اور ضلع کے پیداواری شہری بن سکیں۔

خواتین کے مسائل

رحیم یار خان ضلع میں رحیم یار خان شہر کے علاوہ کوئی دوسرا بڑا اس جیسا شہر موجود نہیں۔ زیادہ تر علاقہ روایات پر چلنے والا ہے جس کی وجہ سے خواتین کو قبائلی طرز کی رسوم و روایات کا سامنا رہتا ہے۔ یہاں کم عمر بچیوں کی شادیاں عام ہیں اور ملکی و صوبائی سطح پر قانون ہونے کے باوجود اس قانون کو حرکت میں دیکھا نہیں جاتا۔ خواتین کے خلاف گھریلو اور سماجی تشدد کے واقعات اکثر اوقات سننے کو ملتے ہیں۔ یہاں رحیم یار خان شہر میں خواتین میں خواندگی تقریباً 50 فیصد کے قریب ہے، مگر ضلع کی سطح پر خواتین میں خواندگی کی شرح بمشکل 15 فیصد تک ہے۔

بچیوں کو پڑھایا نہیں جاتا اور وہ خواتین جو پڑھ لکھ بھی جائیں تو ان کے لیے پیشہ وارانہ مہارتیں حاصل کرنے کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں اور پھر کام کرنے کے مواقع اس سے بھی کم۔ یہ وٹہ سٹہ کی روایات بھی صدیوں سے چلی آ رہی ہیں جس کی وجہ سے گھریلو تشدد کے واقعات میں اضافہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔

حل

سب سے پہلے تو کم عمر بچیوں کی شادیوں کے رسوم و رواج کو ختم کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ملکی و صوبائی سطح پر موجود قوانین کو نہایت جانفشانی اور سختی سے لاگو کرنے کی ضرورت ہے۔ کم عمر بچیوں کی شادیوں کی وجہ سے خواتین کی اک بڑی تعداد زندگی میں آگے بڑھنے کے مواقع سے محروم ہو جاتی ہے اور اکثر اوقات خطرناک بیماریوں کا شکار بھی بن جاتی ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مقامی سطح پر ضلع بھر میں خواتین کے تحفظ کے لیے پولیس اور دیگر حکومتی اداروں کو تربیت فراہم کی جائے اور بالخصوص بڑھتے ہوئے گھریلو تشدد کو کم یا ختم کرنے کے لیے وٹہ سٹہ کی شادیوں کا رواج ختم کیا جائے۔

خواتین کی خواندگی پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضلع کے شہری اور قصباتی مراکز میں تعلیم حاصل کرنے والی خواتین کو زندگی میں مزید آگے بڑھنے کے لیے حوصلہ افزائی کی جائے اور اس سلسلہ میں غیر سرکاری تنظیمیں مقامی میڈیا، عمائدین اور حکومتی اداروں کے ساتھ مل کر اک سرگرم کردار ادا کریں، جو فی الحال نظر نہیں آتا۔ جب کہ دیہاتی علاقے اور چھوٹے قصبات میں خواتین کی عام تعلیم کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

رحیم یار خان ضلع میں بڑی صنعتوں کی موجودگی حوصلہ افزا ہے۔ خواتین کی ترقی کے لیے ان بڑے نجی اداروں کو تعاون کرنا چاہیے اور اس سلسلہ میں مقامی عمائدین اور سماج کی متحرک شخصیات کو ان اداروں کے ساتھ روابط بڑھانے اور مستحکم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ غیر سرکاری تنظیمیں بھی اس سلسلہ میں مقامی عمائدین اور اداروں کی قابلیت بڑھانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔

تعلیم کا مسئلہ

ضلع بھر میں تین یونیورسٹیاں ہیں، مگر اک صنعتی شہر ہونے کے باوجود یہاں فنی مہارتیں سکھانے والے تعلیمی اداروں کا فقدان ہے۔ سرکاری سطح پر پورے ضلع میں 3 پوسٹ گریجویٹ کالجز جبکہ 5 ڈگری کالجز موجود ہیں۔ اس کے علاوہ تقریبا 12 پرائیویٹ کالجز بھی موجود ہیں جن میں سے 6 کالجز خواتین کے لیے ہیں۔ تعلیمی اداروں کی موجودہ تعداد اس لحاظ سے نہایت کم ہے جس لحاظ سے ضلع کی آبادی بڑھی ہے۔

اس کے علاوہ سرکاری اور نجی سطح پر فنی مہارتوں میں بہتری کے لیے ٹیکنیکل ایجوکیشن کے اداروں کی بہت کمی ہے جس کی وجہ سے کم از کم دیہاتی علاقوں کے نوجوان روایتی تعلیم حاصل کر لینے کے باوجود عمدہ روزگار سے محروم رہتے ہیں جس سے سماجی بے چینی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ خواتین کے لیے بالخصوص اک الگ یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت ہے اور اس کے علاوہ خؤاتین کے لیے ہی فنی اور پیشہ وارانہ مہارتوں میں بہتری کے لیے پروفیشنل ٹریننگ اکیڈیمیز کی بھی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔

حل

یونیورسٹیوں کی تعداد گو کہ مناسب ہے، مگر ان کے معیار پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ فیکلٹی ممبران کی تعداد میں عموماً کمی کی شکایات سننے کو ملتی رہتی ہے، اس مسئلہ کو فی الفور حل کیا جانا چاہیے۔ اس کے لیے مقامی عمائدین اور سماجی رہنماؤں کو صوبائی محکمہ تعلیم پر دباؤ بڑھانا چاہیے جس کے لیے مقامی غیر سرکاری تنظیمیں انہیں لاہور میں مناسب مدد اور روابط فراہم کریں۔

خواتین کے لیے اک الگ یونیورسٹی کا قیام بہت ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے لیے پیشہ وارانہ قابلیت اور مہارتوں میں اضافے کے لیے بھی نئے اداروں کو قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ گو کہ نجی شعبہ میں تعلیمی اداروں نے تعلیم کے میدان کا بہت وزن اٹھا رکھا ہے مگر وہاں کے اخراجات ہر کسی کی برداشت اور پہنچ میں نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے بچے تعلیمی میدان میدان میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ سرکاری شعبہ میں تعلیمی سہولیات میں کم از کم دوگنا اضافہ کیا جانا چاہیے اور اس سلسلہ میں مقامی رہنماؤں، بالخصوص سیاسی رہنماؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ضلع اور پھر رحیم یار خان شہر کے عمائدین کو اس سلسلہ میں آگے بڑھنا چاہیے تاکہ ضلع کے بچوں کا تعلیمی مستقبل محفوظ ہو سکے اور ان پر باعزت روزگار کے دروازے کھل سکیں۔

شہری اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ پڑھی لکھی خواتین جو اپنے اور اپنے کنبوں کے لیے باعزت روزگار کمانا چاہتی ہیں، انہیں مزید تعلیمی مواقع اور بالخصوص پیشہ وارانہ قابلیت اور مہارتوں میں بہتری اور اضافوں کا موقع لازما ملنا چاہیے۔ مقامی طور پر خواتین کی پسماندگی تعلیم اور روزگار کے مواقع میں بہتری لانے سے کسی حد تک دور کی جاسکتی ہے۔

ملتان

تعارف

یہ پنجاب کا ایک اہم شہر ہے۔ یہ شہر دریائے چناب کے کنارے آباد ہے۔ آبادی کے لحاظ سے یہ پاکستان کا پانچواں بڑا شہر ہے۔ جنوبی پنجاب کے اضلاع میں ملتان کی حیثیت مرکزی نوعیت کی ہے۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے۔ ملتان ماضی میں ایک سلطنت کا درجہ رکھتا تھا اس کے وسیع و عریض رقبے کی حدود لاہور کے قرب وجوار تک پھیلی ہوئی تھی۔ ابوالفضل نے اپنی مشہور کتاب "آئین اکبری" میں ملتان کی حدود کچھ اسی طرح بیان کی ہیں۔

صوبہ ملتان کے ساتھ ٹھٹھہ کے الحاق سے قبل یہ صوبہ فیروز پور سے فیوستان تک چوڑائی میں کف پور سے جیسلمیر تک، ٹھٹھہ کے الحاق کے بعد یہ صوبہ کیچ مکران تک وسیع ہو گیا۔ مشرق میں اس کی سرحدیں سرہند سرکار سے، شمال میں پشاور سے جنوب میں اجمیر کے صوبہ اور مغرب میں کیچ (تربت) مکران سے ملتی ہیں۔ کیچ مکران پہلے صوبہ سندھ میں شامل تھا۔ ملتان کے صوبہ میں تین سرکاریں ملتان خاص، دیال پور اور بھکر تھیں۔ ملتان کی وسعت اور عظمت پر تاریخ آج بھی رشک کرتی ہے۔

792 کو محمد بن قاسم نے ملتان فتح کیا اور اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ 997 کو محمود غزنوی نے ہندوستان کو فتح کرنے کے ساتھ ملتان کو بھی فتح کیا۔ 1175 میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے خسرو ملک کو شکست دے کر ملتان پر قبضہ کر لیا۔ سلطان شہاب الدین محمد غوری کے بعد بے شمار خاندانوں نے اسے پایہ تخت بنائے رکھا۔ جن میں خاندان غلامان، خاندان خلجی، غیاث الدین تغلق، خاندان سادات، خاندان لودھی، پھر مغلیہ سلاطین کے حکمرانوں تک ملتان مسلم سلطنت کا حصہ رہا۔ رنجیت سنگھ نے ملتان پر حملہ کیا ایک زوردار جنگ ہوئی تاریخ میں اسے جنگ ملتان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ جنگ مارچ 1818 میں شروع ہوئی اور 2 جون 1818 کو ختم ہو گئی۔ رنجیت سنگھ کی فوج نے قلعہ ملتان پر 2 جون 1818 میں قبضہ کر لیا۔ 1857 تک رنجیت سنگھ کے بیٹوں کی حکمرانی رہی۔ 1857 کی جنگ آزادی کے بعد فرنگیوں نے ملتان پر قبضہ کر لیا اور 1947 تک برٹش امپائر کے زیر اثر رہا۔ آزادی کے بعد ملتان پاکستان کا حصہ بن گیا۔

ساہیوال، پاک پتن، اوکاڑہ، میاں چنوں، خانیوال، لودھراں، مظفر گڑھ اور بھکر اس کے علاقوں میں شامل تھے۔ ملتان کے محل وقوع کی بات کی جائے تو اس کے مشرق میں وہاڑی، جنوب مشرق میں لودھراں، شمال میں خانیوال، جنوب میں بہاول پور اور مغرب میں دریائے چناب کے پار مظفر گڑھ واقع ہے۔

یہ زرعی شہر ہے۔ اس میں وسیع رقبے پر آم کے باغات ہیں۔ آم کے باغات اب متاثر ہو رہے ہیں، اس کی وجہ اس کی پھیلتی ہوئی آبادی اور نئی ہاؤسنگ سکیموں کی بنیاد ہے۔

اس شہر کی 1998ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی 3,116,851 نفوس پر مشتمل تھی۔ جبکہ 2017 کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 4,745,109 ریکارڈ کی گئی۔ اس شہر کی آبادی تیزی سے بڑھی ہے۔ جس سے کئی طرح کے مسائل نے جنم لیا۔

اس مسئلے کو حل کیا جاسکتا ہے اگر محکمہ فیملی پلاننگ کی کارکردگی کو بہتر بنایا جائے۔ مقامی سطح پر بڑھتی آبادی کے نقصانات سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔

ملتان میں قومی اسمبلی کے 6 حلقے ہیں۔ این اے 154 تا 159، جب کہ صوبائی اسمبلی کے 13 حلقے ہیں۔ پی پی 211 تا 223۔

ضلع ملتان کے سیاسی خاندان

سید یوسف رضا گیلانی

سید یوسف رضا گیلانی وزیرِ اعظم پاکستان رہے۔ یہ اسپیکر قومی اسمبلی بھی رہے۔ یہ 1988، 1990، 1993، 1997، 2008 کے انتخابات میں کامیاب ہوئے۔ ان کے والد مخدوم سید علمدار حسین گیلانی قرارداد پاکستان کے دستخط کنندگان میں سے تھے اور بعد میں پنجاب میں صوبائی وزیر رہے۔ ان کے چچا مخدوم سید ولایت حسین شاہ ضلع کونسل ملتان کے چیئرمین رہے جبکہ وہ قانون ساز اسمبلی کے رکن بھی رہے۔ ان کے دادا مخدوم سید غلام مصطفیٰ شاہ میونسپل کارپوریشن ملتان کے چیئرمین بھی رہے اور بعد میں 1945-46 کے عام انتخابات میں قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ان کے پر دادا مخدوم سید صدرالدین شاہ گیلانی کو 1910 میں دہلی دربار میں مدعو کیا گیا تھا جبکہ صدرالدین شاہ گیلانی کے بھائی مخدوم سید راجن بخش گیلانی قانون ساز کونسل کے رکن رہے اور بعد میں وہ پہلے مسلمان میئر بنے۔ ان کے بیٹے بھی سیاست میں ہیں۔

قریشی خاندان

مخدوم شاہ محمود قریشی نے 1997، 2002، 2008، 2013 اور 2018 کا الیکشن جیتا۔ یہ 2008 کے انتخابات میں کامیاب ہونے کے بعد وزیرِ خارجہ رہے۔ پھر 2018 میں کامیاب ہونے کے بعد بھی وزیر خارجہ بنے۔ یہ 1985 میں پہلی بار ایم پی اے بنے تھے، ان کے والد سجاد حسین قریشی 1962، 65، 77 میں ایم این اے، 85 میں سینیٹر رہے۔ مخدوم شاہ محمود قریشی کے بیٹے نے 2018 کے انتخابات میں صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑا۔

ہاشمی خاندان

مخدوم محمد جاوید ہاشمی نے 1997، 2002، 2008، 2013 کے انتخابات میں کامیابی سمیٹی۔ ان کا خاندان تحریک پاکستان میں حصہ لینے کے لیے جانا جاتا تھا اور مسلم لیگ کا حصہ تھا۔ یہ پی ایم ایل این سے پی ٹی آئی میں چلے گئے تھے، پھر 2014 میں پی ٹی آئی کے اسلام آباد دھرنا کے دوران، پی ٹی آئی سے الگ ہو گئے۔ اس وقت یہ پی ایم ایل این کا حصہ ہیں۔

شیخ محمد طارق رشید

وہ 1998 سے 2001 تک ملتان کے میئر رہے۔ گورنمنٹ کالج سے گریجویشن کیا۔ ان کے دادا شیخ عبدالصمد کو 1947 میں پاکستان ہجرت کرتے ہوئے قتل کر دیا گیا۔ یہ 2008 اور 2013 کے انتخابات میں کامیاب رہے۔

رانا محمود الحسن

یہ 2002، 2008، 2013 میں کامیاب رہے۔ رانا محمود الحسن کے والد 1993-99 کے دوران مسلسل دو بار رکن پنجاب اسمبلی رہے۔ اور ان کے بہنوئی رانا طاہر شبیر ایم پی رہے۔

سکندر حیات خان بوسن

اپنے سیاسی کیریئر کے دوران وہ ضلع کونسل ملتان کے ممبر، 1985، 1988 اور 1990 میں ممبر پنجاب صوبائی اسمبلی اور 1997 میں ایم این اے منتخب ہو چکے ہیں۔ ان کے دادا جناب خان محمد اکرم خان بوسن نے 1951 کے دوران ممبر پنجاب قانون ساز اسمبلی کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ان کے بھتیجے، مسٹر محمد حسنین بوسن نے 2002-07 کے دوران ممبر صوبائی اسمبلی پنجاب کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اور ان کے سسر مسٹر غلام قاسم بوسن 1985-88 کے دوران پنجاب اسمبلی کے رکن رہے۔

رانا محمد قاسم نون

رانا محمد قاسم نون ولد رانا محمد اسلم نون 10 نومبر 1962 کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے 1985-90 کے دوران پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کے چیف پروٹوکول آفیسر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ وہ عام انتخابات 2002 میں قومی اور صوبائی دونوں نشستوں پر الیکشن لڑتے ہوئے رکن صوبائی اسمبلی پنجاب منتخب ہوئے ہیں۔ انہوں نے 24 نومبر 2003 سے 30 نومبر 2006 تک وزیر زراعت مارکیٹنگ کے طور پر کام کیا۔ ان کے چچا رانا تاج احمد نون 1972-77، 1977 اور 1988-90 کے دوران ایم این اے رہے۔ ان کے چچا رانا شوکت حیات نون 1985-88 کے دوران ایم این اے تھے۔ ان کے چچا، رانا گل محمد نون، 1951-55 کے دوران رکن پنجاب قانون ساز اسمبلی اور 1956-58 کے دوران مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے رکن رہے۔ ان کے بھائی رانا سہیل احمد نون نے 1993-96 کے دوران ممبر پنجاب اسمبلی / پارلیمانی سیکرٹری / وزیر اعلیٰ کے مشیر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اور ان کے کزن رانا اعجاز احمد نون رکن پنجاب اسمبلی رہے۔

پینے کے صاف پانی کا مسئلہ

اس شہر کے باسیوں کو پینے کے صاف پانی کے مسئلے کا سامنا ہے۔ مقامی حکومت کے تحت شہر میں پانی کی ٹینکیاں تو موجود ہیں، مگر ان کے نظام اور پائپ بہت پرانے اور بوسیدہ ہو چکے ہیں، بالخصوص قدیمی ملتان میں تو حالات بہت دگرگوں ہو چکے ہیں جہاں سیوریج اور صاف پانی کی پائپ لائنز ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور کہیں بھی ٹوٹنے کی صورت میں پانی اک دوسرے کے ساتھ مل جاتا ہے جسے پی کر لوگ، بالخصوص بچوں کی صحت کے مسائل رہتے ہیں۔

ملتان شہر اور ضلع میں پینے کے صاف پانی کے مسائل مزید بڑھ رہے ہیں کیونکہ زیرزمین پانی کی سطح مسلسل گر رہی ہے اور اب بہت سی جگہوں پر زیرزمین پانی کڑوا اور آلودہ بھی ہو چکا ہے۔

حل

ملتان شہر اور پورے ضلع میں فوری ضرورت ہے کہ موجود سہولیات کو اپ-گریڈ کیا جائے اور پینے کے پانی کی نئی سکیمیں شروع کی جائیں۔ ضلعی حکومت اس سلسلہ میں گو کہ سستی کا شکار دکھائی دیتی ہے مگر ضلع کے شہریوں کو مقامی عمائدین اور غیر سرکاری تنظیمات کے ساتھ مل کر اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ مسلسل سماجی دباؤ کے ذریعے شہریوں کے مفاد کے لیے زیادہ سے زیادہ منصوبے شروع کروائے جائیں جن میں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال یقینی بنایا جائے۔

نیز، جہاں جہاں ضرورت ہے، وہاں وہاں پانی کی پائپ لائنز کے مسائل حل کیے جائیں اور اس بات کو بھی یقینی بنایا جائے کہ سیوریج اور پانی کے پائپ لائنز ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ نہ چلیں اور نہ ہی کسی صورت ان کا صاف اور گندہ پانی اک دوسرے کے ساتھ مکس ہو سکے۔

آلودگی کا مسئلہ

اس شہر میں دیگر شہروں کی بڑی آبادی آمدورفت روزانہ کی بنیاد پر لگی رہتی ہے اور ایک بڑی آبادی مستقل طور پر اس شہر میں تعلیم اور صحت کے حصول کے لیے موجود رہتی ہے۔ شہر میں ٹریفک کے شور اور دھویں کے مسائل آنکھوں اور سانس کی بیماریاں پیدا کرنے کی وجہ بن رہے ہیں۔

اس کے علاوہ شہر کے اندر بے شمار چھوٹی صنعتیں غیر قانونی طور پر قائم ہیں، اور شہر کے نواح میں بڑی صنعتیں بھی موجود ہیں جن کی چمنیاں 24 گھنٹے دھواں اگلتی رہتی ہیں۔

ٹریفک کی آلودگی تو ہے ہی، اس کے ساتھ صنعتی فضلے اور دھویں کے مسائل بھی روز بروز بڑھ رہے ہیں، اور بالخصوص سردیوں کے دنوں میں یہ آلودگی زمین کی سطح کے قریب تر ہوتی ہے جس میں دھول رک جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے عوام کو بہت مشکلات کا سامنا رہتا ہے۔

حل

شہری علاقے کے اندر درختوں کی بہت قلت ہے۔ زیادہ سے زیادہ درخت لگائے جائیں۔ شہر میں داخل ہونے والی اور چلنے والی وہ گاڑیاں جو دھواں چھوڑتی ہیں، ان پر فوری پابندی لگائی جانی چاہیے۔ شہر کی حدود میں، بالخصوص گنجان آباد جگہوں پر، قائم غیر قانونی چھوٹی صنعتوں کو شہر سے باہر کہیں منتقل کیا جانا چاہیے۔

اس سلسلہ میں ملتان ضلع کی دیگر تحصیل حکومتوں سے مدد حاصل کی جانی چاہیے تاکہ صنعتوں کا اک توبوجھ ملتان شہر پر کم سے کم ہو اور اس کے ساتھ ساتھ ان تحصیلوں میں بھی معاشی اور صنعتی ترقی کا آغاز ممکن ہو سکے۔ پورے ضلعے میں بڑی صنعتوں کو اس بات کا پابند کیا جانا چاہیے کہ ماحولیات کے سرکاری پیمانے ہر صورت میں پورے کریں اور اس سلسہ میں ضلع بھر کے شہریوں کو میڈیا اور غیر سرکاری تنظیمات کے ساتھ مل کر ان بڑے بڑے اداروں پر سماجی دباؤ بڑھانا چاہیے تاکہ آلودگی کے مسائل کا تدارک ممکن ہو سکے۔

زراعت کا مسئلہ

یہ شہر آم کی فصل کی وجہ سے ملک بھر میں شہرت رکھتا ہے۔ یہاں کا آم بیرون ملک وسیع پیمانے پر بھیجا جاتا ہے۔ مگر اس شہر کے کسان کو اسی نوع کے مسائل کا سامنا ہے، جو دیگر شہروں کے کسانوں کو ہے، یعنی سپرے اور دیگر ادوایات مہنگی ہیں اور بسا اوقات زرعی ادویات خود ملتان شہر میں جعلی ملتی ہیں۔

پورے ضلع میں نہری پانی کی تقسیم منصفانہ نہیں اور مقامی طور پر بااثر اور طاقتور خاندان اپنے جائز حصے سے کئی گنا زیادہ پانی استعمال کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے مقامی اور چھوٹے کاشتکار کا مسلسل استحصال ہوتا رہتا ہے۔ ضلع کے کئی علاقوں کو دریائی کٹاؤ کے علاوہ سیم اور تھور کے مسائل کا بھی سامنا ہے اور اس میں اکثر الاوقات زرعی رقبہ بھی آجاتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہاں فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

حل

مقامی حکومت اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی مدد سے ملتان ضلع اور شہر میں زرعی ادویات اور دیگر سہولیات کو یقینی بنایا جائے اور اس بات کو مزید یقینی بنایا جائے کہ یہ کسی طور بھی جعلی نہ ہوں۔ اس سلسلہ میں محکمہ زراعت اور پولیس پر شہریوں کو اپنا دباؤ قائم کرنے کی ضرورت ہے جس مین مقامی غیر سرکاری تنظیمات کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور اس سلسلہ میں میڈیا بھی اپنا فرض ادا کرے۔

ضلع بھر میں دریائی کٹاؤ روکنے کے لیے مزید بند بنائے جائیں اور موجود بندوں کو مزید پختہ اور اپ-گریڈ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ضلعی انتظامیہ سے مسلسل تقاضہ کیا جانا چاہیے کہ صوبائی محکمہ سمال ڈیمز کی سفارشات اور رپورٹس کے مطابق ضلع بھر میں ان مقامات پر فوری طور پر بند تعمیر کیے جائیں جہاں جہاں سیلاب اور دریائی کٹاؤ کے خطرات مسلسل موجود رہتے ہیں۔

ضلع بھر میں زراعت کو جدید خطوط پر استوار کیا جائے اور بالخصوص ملتان کی پہچان، یعنی آم کی فصل کو مزید پھلنے پھولنے کے مواقع دیئے جائیں۔ ضلعی حکومت کو چاہیے کہ آم کے رقبے پر ہاؤسنگ کالونیوں کی تعمیر نہ ہونے دی جائے، چاہے وہ کسی نجی ادارے کی ہوں یا کسی سرکاری ادارے کی۔ اس سلسلہ میں شہریوں کو صوبائی حکومت کے ساتھ مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

لیہ

مختصر تعارف

ضلع لیہ کی1997 کی مردم شماری کے مطابق آبادی 11لاکھ 22ہزار9سو51 تھی۔ جبکہ 2017 کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 18لاکھ 24ہزار2سو30 تھی۔ مقامی سطح پر 2017 کی آبادی پر تحفظات پائے جاتے ہیں۔ خیال ہے کہ یہ آبادی، شمار کی گئی آبادی سے کہیں زیادہ ہے۔

یہاں سرکاری سطح پر فیملی پلاننگ کا محکمہ موجود ہے، اس محکمے کے یونٹ بستیوں میں بھی موجود ہیں، مگر اس کی کارکردگی پر سوالیہ نشانات ہیں۔ اس محکمہ کو فعال کیا جائے اور عملہ کی کارکردگی کا جائزہ لے کر لائحہ ترتیب دیا جائے۔ دیہی ثقافت میں بالخصوص کچے کے علاقے میں مذہبی، سماجی اور سیاسی رہنماؤں کی معاونت لی جائے۔ یہ شخصیات لوگوں کے اندر بڑھتی آبادی کے نقصانات سے روشناس کروائیں۔

یہ ضلع تھل اور دریائے سندھ کا حسین امتزاج رکھتا ہے۔ اس جغرافیائی تقسیم کی وجہ سے یہاں موسم، رواج و کلچر، سیاست و مذہب میں تنوع پایا جاتا ہے۔ دریائے سندھ کے علاقہ، جسے کچے کا علاقہ کہا جاتا ہے، وہاں ایسے خاندان آباد ہیں، جو اس شہر کے قدیمی باشندے ہیں۔ یہ بہت سادہ طبیعت کے لوگ ہیں۔ سیاسی سطح پر یہ دھڑے بندی اور ذات پات، عقیدہ کے زیر اثر رہتے ہیں۔ مذہبی سطح پر یہاں دیوبندی اور شیعہ آبادیاں ہیں، یہاں ماضی میں فرقہ وارانہ واقعات بھی ہوتے رہے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا زیادہ تر انحصار کھیتی باڑی اور مویشیوں پر ہے۔ یہاں کی اہم فصلیں، کماد اور گندم ہیں، جبکہ کچھ عرصہ سے چاول کی کاشت بھی کی جاتی ہے۔

یہاں مویشی گائے اور بکریاں و بھیڑیں پالی جاتی ہیں۔ یہاں شرح خواندگی کم ہے۔ تھل کا علاقہ صحرا پر مشتمل ہے، جس میں پوری چوبارہ تحصیل آتی ہے۔ یہاں کی بڑی آبادی آبادکاروں پر مشتمل ہے، جن کی زبان پنجابی ہے، اِن آبادکاروں نے صحرا کو زراعت کا علاقہ بنا کر رکھ دیا۔ سیاسی سطح پر یہ لوگ پنجابی اُمیدوار کو اہمیت دیتے ہیں۔ مذہبی سطح پر یہاں فرقہ واریت کا کوئی سخت گیر تصور موجود نہیں۔ یہاں کی بڑی فصلوں میں مالٹا کے باغات، گندم اور کپاس ہیں۔ تھل کا علاقہ نہری ہے۔ اس شہر میں مجموعی طور پر تین زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہاں کی مقامی زبان سرائیکی ہے۔ شہری ثقافت میں اُردو بولنے والے مہاجرین بڑی تعداد میں رہائش پذیر ہیں، یہ طبقہ شہر میں تجارت پیشہ ہے۔ آبادکار طبقہ کی زبان پنجابی ہے۔ لیہ کے کئی چکوک، دو بڑے قصبات فتح پور اور چوک اعظم میں پنجابی لوگ رہائش پذیر ہیں۔ چوک اعظم، فتح پور میں زیادہ تر کاروباری طبقہ پنجابی ہے۔ لیہ گرم شہروں میں شمار ہوتا ہے۔

لیہ شہر کو1982 میں ضلع کا درجہ ملا، اس سے قبل یہ مظفر گڑھ کی تحصیل تھا۔ ضلع بننے کے یہ انتظامی سطح پر 3 تحصیلوں، تحصیل لیہ، تحصیل چوبارہ اور تحصیل کروڑ میں منقسم ہے۔ لیہ میں قومی اسمبلی کے 2 حلقے ہیں۔ این اے187 تا188 اور لیہ میں صوبائی اسمبلی کے 5 حلقے ہیں۔ پی پی280 تا284

قومی و صوبائی نشستوں پر چند خاندان انتخابات ہی حصہ لیتے چلے آرہے ہیں، تاہم 2008 کے بعد چند ایک نئے نام سیاسی و انتخابی عمل کا حصہ بنے ہیں۔

لیہ کے سیاسی خاندان

سہیڑ خاندان: جہانگیر خان سہیڑ یہ 2 بار ایم این اے رہے۔ بہادر خان سہیڑ 2 بار ایم این اے رہے۔ سجاد خان سہیڑ، تحصیل ناظم کروڑ لعل عیسن رہے۔ شہاب الدین خان سہیڑ 1 بار ضلع ناظم لیہ رہ چکے ہیں اور یہ اس وقت ایم پی اے بھی ہیں۔ جبکہ ان کے بھائی محی الدین خان سہیڑ بھی ایم پی اے کا الیکشن لڑ چکے ہیں۔

اولکھ خاندان: احمد علی اولکھ، یہ 7 بار ایم پی اے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے بھائی عمر اولکھ چیئرمین ضلع کونسل رہے ہیں۔

سواگ خاندان: صاحبزادہ فیض الحسن یہ 4 بار ایم این اے رہے ہیں۔ ان کے خاندان میں غلام محمد سواگ اور شکور سواگ 1، 1 بار ایم پی اے رہے ہیں۔

بھٹی خاندان: صفدر عباس بھٹی 1 بار ایم پی رہے۔

سامٹیہ خاندان: ملک اللہ بخش سامٹیہ 1 بار ایم پی رہے۔

تھند خاندان: غلام حیدر تھند 1 بار ضلع ناظم لیہ اور 1 بار ایم این اے رہ چکے ہیں۔ 2 بار ایم پی اے رہ چکے ہیں، اس خاندان کے مہر اللہ ڈیوایا تھند نے 5 بار ایم پی اے کا الیکشن لڑا۔

جکھڑ خاندان: ملک نیاز جکھڑ 4 بار ایم این اے رہے۔ ان کے ماموں ملک قادر بخش جکھڑ 1946 کے الیکشن میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے جیت چکے ہیں۔ ملک نیاز سامٹیہ کے بھتیجے ملک نور نبی جکھڑ 2 بار ایم پی اے کا الیکشن لڑ چکے ہیں۔ لیکن جیت نہ پائے۔

سمرا خاندان: ملک منظور سمرا 1 بار ایم این اے رہ چکے ہیں۔ ان کے بھائی مہر فضل حسین سمرا 2 بار ایم پی اے رہ چکے ہیں۔

سید خاندان: سید خورشید شاہ 1 بار ایم این اے رہ چکے ہیں۔ سید محمد ثقلین شاہ 2 با ایم این اے رہ چکے ہیں۔

نیازی خاندان: عبدالمجید خان نیازی 1 بار ایم پی اے 1 بار ایم این رہے (

مگسی خاندان: تحصیل چوبارہ میں مگسی خاندان ہمیشہ سے برسرِ اقتدار چلا آرہا ہے۔ قیصر خان مگسی اس وقت ایم پی اے ہیں۔

2008 کے بعد کھتران خاندان، بھلر خاندان، سہو، رندھاوا خاندان سیاسی میدان میں نمایاں ہو رہے ہیں۔

صحت کے مسائل

اس شہر میں ضلعی ہیڈ کوارٹر ہسپتال سمیت، 6 تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتال ہیں، دیہی مراکز صحت کی تعداد 6 ہے جبکہ بنیادی مرکز صحت کی تعداد 36 ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ضلع بھر میں 34 ڈسپنسریز ہیں۔ ایک عرصہ سے ہیپاٹائٹس اور کینسر کے مریضوں میں اضافہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ اسی طرح شوگر اور بلڈ پریشر کے مریض بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔

یہاں ضلعی سطح پر سرکاری ہسپتال موجود ہے، مگر سیریس مریضوں کو ملتان نشتر ریفر کیا جاتا ہے۔ تحصیل سطح پر سرکاری ہسپتال بھی عدم سہولیات کا شکار ہیں۔ خواتین اور بچوں کے طبی مسائل کے حوالے سے یہاں سہولیات کا شدید فقدان ہے اور زچہ و بچہ کے مسائل کے علاوہ کم عمر بچوں کے طبی مسائل بھی یہاں کی سماجی گفتگو کا مسلسل حصہ بنے رہتے ہیں۔ شہری ضلعی حکومت اور صوبائی حکومت سے اس سلسلہ میں شاکی رہتے ہیں، مگر اس معاملہ پر کوئی سنجیدہ اور مسلسل کوشش دیکھنے میں نظر نہیں آتی۔

حل

ضلعی ہیڈکوارٹر ہسپتال کو وسعت دی جائے اور ڈاکٹروں اور جدید ٹیکنالوجی کی تعداد کو بڑھایا جائے۔ نیز ضلع بھر میں نجی ہسپتالوں کی تعمیر کے لیے مواقع پیدا کیے جائیں اس کے علاوہ، ایم آر آئی مشین کی سہولت دی جائے، بلکہ ضلعی اور تحصیل سطح کے تمام سرکاری ہسپتالوں میں کم از کم ایک ایم آر آئی مشین کا موجود ہونا لازمی ہے۔

خیال ہے کہ یہاں کے شہریوں کو اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ وہ سیاسی اور سماجی طور پر ان مسائل کو ضلعی اور صوبائی حکومتوں کے سامنے لاتے رہیں اور اس سلسلہ میں غیر سرکاری تنظیموں کو بلاشبہ اپنا کردار ادا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہسپتالوں کی تعداد کو تقریباً100 فیصد بڑھانے کی ضرورت ہے، بالخصوص ضلعی ہیڈکوارٹر کی سطح پر، مگر موجود تعداد میں صرف50 فیصد اضافہ بھی صحت کے موجودہ مسائل کو حل کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔

زراعت سے جڑے مسائل

زراعت کے شعبہ کو گوناگوں مسائل کا سامنا ہے۔ دریائی علاقہ میں جہاں کماد، گندم اور کسی حد تک چاول کی فصلیں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں، سیلاب کی زد میں آئی رہتی ہیں۔ فصلوں کے ساتھ ساتھ مویشی بھی سیلاب میں بہہ جاتے ہیں۔ یہاں کی انسان آبادی اور زرعی زمینوں کو دریا کے کٹاؤ کا سامنا بھی رہتا ہے۔ مجموعی طور پر یہاں کاشت کاری کے لیے جدید زرعی آلات کا استعمال کم ہوتا ہے۔

کماد کی چھلائی اور کٹائی اور گندم کی کٹائی کے روایتی طریقے رائج ہیں، جس کی وجہ سے فصل پر خرچہ زیادہ اُٹھتا ہے اور کسان کو منافع کم ملتا ہے۔ اس کے علاوہ لیہ میں شوگر ملز سے کسانوں کو عام شکایت ہے کہ وہ کماد کی فصل کے بھاؤ اور تول میں نقصان کرتی ہے۔

حل

دریا کے کٹاؤ اور سیلابی کیفیت سے بچنے کے لیے بند باندھے جائیں۔ اگرچہ بند مختلف جگہوں پر باندھے گئے ہیں، مگر ان کی تعداد کو زیادہ کیا جائے۔ کسانوں کو جدید ٹیکنالوجی سے کاشت کاری کی ترغیب دی جائے اور محکمہ زراعت کا فعال کردار ادا کرنا ہوگا۔ مویشیوں سے زیادہ دودھ اور گوشت حاصل کرنے کے لیے محکمہ لائیو اسٹاک کو کردار ادا کرنا ہوگا۔ بنیادی طور پر زرعی علاقہ ہونے کی وجہ سے،

یہاں زراعت سے جڑے تمام موضوعات کو اک مربوط طریقے سے سمجھنے اور ان پر ترقی کرنے کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں محکمہ زراعت کے علاوہ ضلعی و صوبائی ترقیاتی اداروں کو مقامی رہنماؤں کے ساتھ مل بیٹھ کر ضلع کا زرعی ترقیاتی منشور بنانے کی ضرورت ہے۔

علاوہ ازیں، ہر سال پیدا ہو جانے والے مسائل، جو گنے کے کاشتکاروں کو دیکھنا پڑتے ہیں، قانون نافذ کرنے والے اداروں کو شوگر ملز انتظامیہ کے خلاف کسانوں کی شکایات کا ازالہ کرنا چاہیئے۔

ماحولیاتی آلودگی کا سنجیدہ مسئلہ

لیہ میں ماحولیاتی آلودگی کو لیہ شوگر ملز نے بہت مہمیز کیا ہے۔ یہ شوگر ملز عین شہر کے درمیان میں موجود ہے۔ اس کی آواز اور راکھ سے کئی طرح کی بیماریاں پھیل رہی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اس کا فضلہ جو قریبی نہر (لیہ مائنر) میں ڈالا جاتا ہے، وہ زراعت کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس شوگر ملز کے ارد گرد کے علاقے کا پینے کا پانی آلودہ ہو رہا ہے۔

ماحولیاتی آلودگی کی دوسری بڑی وجہ جنگلات کے رقبے پر بااثر افراد کا قبضہ ہے اور جنگلات ختم ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایک زمانے میں یہ شہر جنگلات کی وجہ سے شہرت رکھتا تھا، مگر یہاں جنگلات کا رقبہ رہائشی کالونیوں میں تبدیل ہو چکا ہے اور جو رقبہ بچا ہوا ہے، وہاں درختوں کا کٹاؤ جاری رہتا ہے۔ علاقہ کروڑ کے جنگلات اور چوک اعظم کے جنگلات ختم ہو کر رہ گئے ہیں۔

حل

شوگر ملز کو شہر سے دور منتقل کیا جائے، یہ کوئی مشکل کام نہیں، اس کی مثالیں دیگر شہروں میں موجود ہیں کہ صنعتوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا گیا۔ جنگلات کے رقبہ پر مقامی بااثر اور سیاسی افراد کا قبضہ چھڑایا جائے اور قانون نافذ کرنے والے ادارے اس سلسلہ میں محکمہ جنگلات کے ساتھ مل کر اک مربوط کارروائی کریں۔

محکمہ جنگلات میں سے سیاسی اور انتظامی مداخلت کو مکمل ختم کیا جائے اور اس بات کا احساس کیا جائے کہ جنگلات اگر اسی رفتار سے ختم ہوتے رہے تو یہ یہاں کی مقامی آبادی کے لیے بہت بڑے مسائل کو جنم دیں گے۔ اس محکمہ کو پیشہ وارانہ بنیادوں پر فعال کیا جائے اور درختوں کی سالانہ بوائی میں کم از کم 100 فیصد اضافہ کیا جائے۔ نیز، مقامی اور باہر سے آئے بااثر اور امیر افراد پر مشتمل ٹمبر مافیا کے خلاف سخت ایکشن لیا جائے۔

تعلیم کو درپیش مسائل

ضلع لیہ میں تعلیم کے لحاظ سے جنوبی پنجاب کے تمام شہروں سے بلند مقام رکھتا ہے۔ یہاں کئی یونی ورسٹیوں کے سب کیمپس اور پوسٹ گرایجوایٹ کالجز ہیں، ہر حلقے میں ڈگری کالجز موجود ہیں۔ لیکن شہر میں نجی تعلیمی شعبہ چھایا پڑا ہے۔ اس نجی شعبہ نے معیارِ تعلیم کو تو بلند کر دیا ہے، مگر سرکاری تعلیمی ادارے اُجڑ چکے ہیں۔

ضلع بھر میں سرکاری و نجی شعبہ میں لڑکوں کے تقریبا 809 سکول ہیں۔ جبکہ گرلز سکولوں کی تعداد 713 ہے۔ یہاں بوائز اور گرلز کالجز کی تعداد 20 ہے۔ یہاں بہاؤ الدین زکریا یونی ورسٹی کا سب کیمپس، بہادر کیمپس کے نام سے موجود ہے۔

حل

علاقہ زرعی ہونے کے باوجود غربت و عسرت کا بھی شکار ہے جس کی وجہ سے ہر خاندان اپنے بچوں کو نجی سکولوں میں نہیں بھیج سکتا۔ حکومت کو چاہیے کہ سرکاری تعلیمی اداروں کے معیار میں اضافہ کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ، ان کی تعداد میں بھی اضافہ کیا جائے۔ ان میں اساتذہ کی حاضری کو پورا سال یقینی بنایا جائے اور جو اساتذہ نجی تعلیمی ادارے اور اکیڈمیاں چلاتے ہیں، اُن کو پابند کیا جائے کہ وہ سرکاری تعلیمی ادارے میں اپنی خدمات کو یقینی بنائیں۔

اس کے ساتھ ساتھ فنی اور پیشہ وارانہ مہارتوں کے تعلیم و تربیت کا بھی بندوبست کیا جائے اور اس سلسلہ میں غیر سرکاری تنظیمات کا تعاون حاصل کیا جانا چاہیے۔

بے روزگاری کا مسئلہ

یہاں تعلیمی شرح بلند ہے، جس کی وجہ سے پڑھے لکھے افراد کی تعداد زیادہ ہے، مگر انھیں بے روزگاری کا سامنا ہے۔ اس بے روزگاری کی وجہ سے نوجوان دیگر شہروں اور ملک سے باہر جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیہ شوگر ملز کے علاوہ شہر بھر میں کوئی انڈسٹری نہیں ہے۔ زراعت کے شعبہ میں نوجوانوں کی شمولیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیہ شوگر ملز میں مقامی محنت کشوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

حل

نوجوانوں کو زراعت کے شعبے کی جانب مائل کیا جائے۔ ذاتی کاروبار کے مواقع پیدا کیے جائیں اور شہر میں صنعتکاری کو مزید فروغ دیا جائے۔ نوجوانوں میں انٹرنیٹ سے جڑی مہارتیں پیدا کی جانی چاہیئں اور اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو یقنی بنایا جانا چاہیے کہ ان میں خواتین کی شمولیت بھی برابری کی سطح پر ہو تاکہ خواتین کے لیے بھی پیشہ وارانہ و معاشی ترقی کے مواقع میں اضافہ ہو۔

شاہرات اور سیور تیج کا مسئلہ

اس شہر کی تمام چھوٹی بڑی سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ یہ سڑکیں دورویہ بھی نہیں، جس کی وجہ سے ٹریفک حادثات بد قسمتی سے روزانہ کا معمول ہیں۔ لیہ تا چوک اعظم اور لیہ تا کروڑ لعل عیسن سڑک بہت خستہ حالت میں ہے۔

نیز شہر بھر میں سیور تیج کا کوئی نظام نہیں، شہر بھر کی گلیاں گندے پانی سے بھری رہتی ہیں اور سیور تیج کا پانی نہر میں ڈالا جاتا ہے جس کا اثر براہ راست فصلوں اور پھر فصلوں کے ذریعے انسانی صحت پر ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں شہریوں اور مقامی حکومتی اہلکاروں کے مابین کسی قسم کا کوئی تعاون موجود نہیں۔ مقامی حکومتی اہلکار بھی کوئی زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کرتے دیکھے جاتے۔

حل

مرکزی سڑکوں کو دورویہ کیا جائے تاکہ ٹریفک کا بہاؤ ٹھیک رہے اور حادثات میں کمی آئے۔ سیور تیج کے نظام کو درست کیا جائے اور شہر بھر کا گندہ پانی نہر میں نہ ڈالا جائے۔ مقامی حکومت کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ صحت و صفائی سے جڑے معاملات اور انتظامات پر خصوصی توجہ دے تاکہ شہریوں اور شہری علاقے کا معیار زندگی بہتر اور بلند ہو سکے۔

خواتین کے مسائل

یہاں کی خواتین کو دو طرح کے بنیادی مسائل کا سامنا ہے: لیہ کے آس پاس کے کچے کے علاقے میں کم عمری کی شادیاں بہت زیادہ ہوتی ہیں اور دوسرا یہ کہ لیہ شہر یا ضلع میں موجود قصبات میں موجود خواتین کو روزگار کے مواقع دستیاب ہی نہیں۔

حتیٰ کہ وہ خواتین جو اپنی تعلیم مکمل بھی کر لیتی ہیں، ان کے لیے بھی مقامی سطح پر کسی قسم کی کوئی تربیت، یا پھر معاشی و پیشہ وارانہ مواقع مہیا نہیں جس کی وجہ سے وہ معاشرتی و معاشی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔

حل

کم عمر بچیوں کی شادیوں کی روک تھام کے لیے مذہبی علماء کی خدمات لی جائیں اور موجودہ پاکستانی قوانین کو سختی سے لاگو کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں غیر سرکاری تنظیمیں، تعلیمی ادارے اور مقامی ایکٹوسٹس کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنا کردار ادا کریں اور ایسے پراجیکٹس لے کر آئیں جو اس معاملہ پر مقامی افراد و معاشرہ کی ذہن سازی کرنے والے ہوں۔

خواتین، بالخصوص، پڑھی لکھی خواتین کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کیے جائیں اور مقامی سطح پر گھریلو صنعتوں کو فروغ دے کر خواتین کی ہنر کاری سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ اس سلسلہ میں غیر سرکاری تنظیمات کو آگے بڑھ کر اک سرگرم کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے جب کہ انہیں مقامی سہولت فراہم کرنے کے لیے مقامی میڈیا کے اراکین کو بھی آگے بڑھنا ہو گا۔

لودھراں

مختصر تعارف

ضلع لودھراں کی 3 تحصیلیں ہیں: لودھراں، کہروڑ پکا، دنیا پور۔

قومی شاہراہ (N 5) اس شہر کے درمیان سے گزرتی ہے اور اس کو ملتان، بہاولپور، لاہور، اسلام آباد، پشاور، کراچی اور پاکستان کے دوسرے بڑے شہروں سے ملاتی ہے۔ لودھراں ریلوے اسٹیشن پاکستان ریلویز کی کراچی، پشاور مرکزی ریلوے لائن پر لودھراں شہر کے درمیان واقع ہے۔

یہ ملتان کا جڑواں شہر ہے۔ لودھراں میں مختلف زبانیں بولنے والے لوگ ہیں۔ ان میں اردو پنجابی سرائیکی رانگڑی پشتو قابل ذکر ہیں۔ یہاں پر سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان سرائیکی ہے جو پورے ضلع میں 80 فیصد بولی جاتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کا زیادہ تر پیشہ زراعت ہے۔ اس شہر کی بڑی برادری آرائیں برادری ہے، جو کھیتی باڑی سے جڑی ہوئی ہے۔ یہاں گندم، کپاس اور باغات قابل ذکر ہیں۔ باغات میں آم کے باغ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

ضلع لودھراں کی 1998ء کی مردم شماری کے مطابق، آبادی 1,171,800 نفوس پر مشتمل تھی۔ جبکہ 2017 کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 1,700,620 ریکارڈ کی گئی۔ اس شہر کی آبادی تیزی سے بڑھی ہے۔ جس سے کئی طرح کے مسائل نے جنم لیا۔ اس مسئلے کو کافی حد تک قابو پایا جاسکتا ہے، اگر محکمہ فیملی پلاننگ کی کارکردگی کو بہتر بنایا جائے۔ مقامی سطح پر بڑھتی آبادی کے نقصانات سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔

ضلع لودھراں میں قومی اسمبلی کے 2 حلقے ہیں۔ این اے 160 اور 161، جب کہ صوبائی اسمبلی کے 5 حلقے ہیں۔ پی پی 224 تا 228۔

لودھراں کے سیاسی خاندان

صدیق خان کانجو 1990 میں ایم این اے رہے اور ان کا بیٹا عبدالرحمن کانجو بھی ایم این رہا۔ رحمن کے چچا اختر خان کانجو 2013 میں ایم این اے تھے۔ رحمان کے کزن اکرم خان کانجو 2013 میں ایم پی اے تھے۔

شاہ محمد جوئیہ 1985 میں ایم پی اے تھے اور ان کے صاحبزادے سجاد خان جوئیہ ایم پی اے تھے۔ ان کے چچا صدیق جوئیہ 1997 میں ایم پی اے تھے۔

رب نواز نون 1985 میں ایم پی اے اور ان کے بھائی ممتاز خان نون 1993 میں ایم پی اے تھے، ان کے بھائی اعجاز نون 2013 میں ایم پی اے تھے۔

ملک طیب اعوان 1985 میں ایم پی اے اور ان کے بیٹے اسلم اعوان 1997 میں ایم پی اے تھے۔

اقبال شاہ 2013 میں ایم پی اے تھے اور ان کا بیٹا امیر شاہ ایم پی اے ہے۔

رفیق آرائیں 1993 میں ایم پی اے اور ان کے بھائی شفیق آرائیں ایم این اے تھے۔

صدیق بلوچ ایم پی اے اور ان کے دادا نور محمد 1970 میں ایم پی اے تھے۔ ان کے والد جند وڈا خان مرحوم 1985 میں ایم پی اے تھے۔

نواب امان اللہ 2008 میں ایم این اے تھے اور ان کے نواب احسان اللہ ایوب دور میں بی ڈی ممبر تھے۔

احمد خان بلوچ 2013 میں ایم پی اے تھے اور ان کے بیٹے مجید خان بلوچ موجودہ ایم پی اے تھے۔

ناصر بیگ 1993 میں ایم این اے اور وفاقی وزیر کھیل تھے اور ان کے بیٹے نے 2017 میں ضمنی الیکشن لڑا لیکن وہ ہارے اور کبھی جیت نہ سکے۔

پیر اکبر علی شاہ 1993 میں ایم پی اے تھے اور ان کے داماد رائے الدین شاہ 2013 میں ایم پی اے تھے۔ ان کے بھائی اللہ الدین شاہ چیئر مین ضلع کونسل تھے۔

2013 کے الیکشن میں جہانگیر خان ترین ایم این اے منتخب ہوئے اور پھر نااہل ہو گئے اور ان کے بیٹے علی ترین نے 2017 میں الیکشن لڑا لیکن اپنے والد کی سیٹ سے ہار گئے۔

صحت کے مسائل

لودھراں چونکہ ایک چھوٹا شہر ہے۔ اس میں صحت کے بڑے مراکز نہیں ہیں۔ ضلعی سطح پر صرف 3 بڑے سرکاری ہسپتال ہیں، مگر وہاں پر بھی طبی سہولیات کا عمومی فقدان رہتا ہے اور مریضوں کو ملتان کے بڑے سرکاری ہسپتالوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ پورے ضلع میں صرف 16 ڈسپنسریز ہیں اور دیہی صحت کے مراکز کی تعداد صرف 4 ہے۔ بنیادی صحت کے مراکز 48 ہیں۔ شہریوں کا خیال ہے کہ یہ تعداد قطعاً مناسب نہیں۔ بھلے لودھراں شہر ملتان کے قریب ہے، مگر ضلعی ہیڈ کوارٹر کے علاوہ ضلع کے دوسرے قصبات اور دیہات کی آبادی بسا اوقات ملتان جانے کی بھی معاشی سکت نہیں رکھتی تو ضلع میں صحت کے مراکز میں جلدی اور بہت زیادہ اضافہ کیے جانے کی اشد ضرورت ہے۔

ڈسٹرکٹ اور تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتالوں میں بھی طبی سہولتوں اور حساس نوعیت کے مشینوں کا فقدان ہے۔

بسا اوقات تو سادہ ایکسرے کے لیے بھی نجی ہسپتالوں میں جانا پڑتا ہے جو کئی مرتبہ عوام الناس کی معاشی پہنچ سے باہر ہوتا ہے۔ اس سارے سلسلے میں خواتین کے لیے صحت کی سہولتوں پر بھی گفتگو سماجی سطح پر دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ان کے طبی مسائل اور زچہ وبچہ کے مراحل کے حوالے سے بھی عوامی شعور اتنا واضح نہیں اور ساتھ ہی میں ضلعی حکومت کی جانب سے بھی کوئی حرکت دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ان مسائل کا تدارک لازم اور ضروری ہو چکا ہے۔

حل

لودھراں میں مخدوم عالی ٹراما سینٹر موجود ہے، مگر اس کی حالت دگرگوں ہے۔ اس کو جلد از جلد بحال کیا جائے اور اس کے لیے شہریوں کو اک سماجی تحرک کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ تحصیل کروڑ پکا، لودھراں روڈ پر ٹراما سینٹر بنایا جائے کیونکہ صرف ایک ہی ٹراما سینٹر پورے ضلع کی ضروریات کے لیے کافی نہیں، بالخصوص خواتین کو پیش آجانے والی ایمرجنسیز میں تو کم از کم 3 ٹراما سینٹرز کا قیام اشد ضروری ہے۔ نیز، لودھراں فیملی ہسپتال کو جدید سہولیات سے آراستہ کیا جائے اور وہاں ڈاکٹروں کی تعیناتی میں ہو جانے والی دیر کا سخت نوٹس لے کر اس معاملہ کو حل کروایا جانا چاہیے۔

زچہ وبچہ کے مسائل کے حوالے سے اس ہسپتال کی سماجی سطح پر اہمیت بہت مسلم ہے تو اس لیے اس میں خواتین اور بچوں کے لیے تمام ضروری سہولیات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ، ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال کی اپ گریڈیشن بہت ضروری ہو چکی ہے۔ وہاں آئے روز کسی نہ کسی مشین میں خرابی رہتی ہے اور خراب مشینوں کو نہ تو ٹھیک کروایا جاتا ہے اور نہ ہی ان کو تبدیل کیا جاتا ہے۔ محکمہ صحت کے اہلکاروں پر سماجی اور حکومتی دباؤ ہونا چاہیے تاکہ ایسی کوئی صورتحال کسی کی جان کے لیے خطرے کا سبب نہ بنے۔

شہریوں اور اس سلسلہ میں غیر سرکاری تنظیمات کے ساتھ مل کر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ شہر بھر میں زچہ بچہ سہولیات کا شدید فقدان ہے اور اس وجہ سے خواتین کی زچگی کے دوران اموات میں اضافہ ہوا ہے۔ جب ضلعی سطح کے شہر میں یہ صورتحال ہے تو دور دراز کے علاقوں کا معاملہ تو مزید گھمبیر ہو گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ خواتین کے لیے مزید زچہ وبچہ سینٹرز کا قیام عمل میں لایا جائے اور تحصیل اور یونین کونسل کی سطح تک صحت کی سہولیات خواتین کی پہنچ میں ہونی چاہئیں۔

زراعت سے جڑے مسائل

زراعت کے شعبہ کو گوناگوں مسائل کا سامنا ہے۔ مجموعی طور پر یہاں کاشت کاری کے لیے جدید زرعی آلات کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔ کماد کی چھلائی اور کٹائی اور گندم کی کٹائی کے روایتی طریقے رائج ہیں، جس کی وجہ سے فصل پر خرچہ زیادہ اُٹھتا ہے اور کسان کو منافع کم ملتا ہے۔ اس کے علاوہ، پانی کے مسائل بھی سارا سال رہتے ہیں۔ بااثر اور مقامی طور پر طاقتور افراد مبینہ طور پر سرکاری اداروں کے ساتھ ملی بھگت کر کے پانی کا استعمال اپنی زمینوں کے لیے زیادہ بہتر کروا لیتے ہیں جس کی وجہ سے چھوٹے کاشتکار مسلسل معاشی دباؤ کا شکار رہتے ہیں۔

حل

محکمہ زراعت کو فوری طور پر شدید فعال کرنے کی ضرورت ہے تا کہ مقامی سطح پر، بالخصوص، چھوٹے کاشتکاروں کے مسائل کو حل کیا جاسکے۔ یہاں ان کسانوں کو جدید طریقہ کاشتکاری کے لے تربیت فراہم کرنے کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں مقامی غیر سرکاری تنظیموں کو شہریوں کے ساتھ مل کر تعاون کی اک فضامیں یہ کام سرانجام دیناچاہیے۔

چھوٹے پیمانے پر کاشتکاری میں زوال کی وجہ سے بیروزگاری میں بھی اضافہ کا خدشہ رہتاہے۔ضرورت ہے کہ محکمہ زراعت، کسانوں کو نئ فصلات کی طرف مائل کرے، جو ان کے معاشی مسائل کو حل کرنے میں معاون ثابت ہوں۔ آگاہی پروگرامز کی ضرورت شدید ہے۔اس کے ساتھ ساتھ آب پاشی کے نظام میں بہتری لاکر کسان کی فصل کو زیادہ ثمر بار کیاجاسکتاہے اور اس سلسلہ میں مقامی طور پر طاقتور اور بااثر افراد کی سیاسی وانتظامی مداخلت کو فی الفور روکنے کی ضرورت ہے۔

ماحولیاتی آلودگی اور صاف پانی کامسئلہ

شہر میں اور شہر کے آس پاس تقریباً24 گھنٹے ٹریفک جاری رہتی ہے جس کی وجہ سے شور اور دھواں فضا کو آلودہ کر تارہتاہے۔ٹریفک پولیس موجود توہے، مگر اس کے باوجود خراب اور دھواں چھوڑتی گاڑیاں سڑکوں پر دوڑتی نظر آتی ہیں۔انہیں چاہیے کہ ایسی گاڑیوں کا شہر میں چلنابند کریں جو دھواں چھوڑتی ہیں۔ اسی طرح،لودھراں شہر میں پینے کے صاف پانی بھی ایک بڑامسئلہ موجودہے جس کی وجہ سے شہری کئی مہلک بیماریوں میں ملوث پائے جاتے ہیں۔

پانی کے فلٹریشن پلانٹ یاتو بہت پرانے ہوچکے ہیں یاپھر ناکارہ ہیں۔ ضلعی اور مقامی انتظامی اہلکاروں کی توجہ اس معاملہ پر دیکھنے کو نہیں ملتی۔

حل

یہ ضروری ہے کہ شہر میں اور شہر کے آس پاس ٹریفک کے نظام کو بہتر کیاجائے، اور پرانی گاڑیوں کا شہر میں داخلہ فوری طور پر بند کیا جائے۔ پبلک ٹرانسپورٹ کے طور پر چلنے والی تمام گاڑیوں کی سالانہ انسپیکشن ہونی چاہیے اور کسی بھی قسم کی ناکارہ گاڑی کو سڑک پر آنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ لودھراں شہر اور ضلع کے دیگر مقامات پر ضلعی حکومت کو صاف پانی کے فلٹریشن پلانٹس لگانے چاہئیں اور پہلے سے موجود فلٹریشن پلانٹس کو ٹھیک کرواکر انہیں بھی اپ گریڈ کرواناچاہیے۔

ضلع میں زیرِ زمین پانی کے ذخائر کو پینے کے قابل بنایاجائے، اور اس کے لیے لوگوں میں آگاہی اور حساسیت بھی پیدا کی جائے کہ پانی کو ضائع نہیں کیاجاناچاہیے۔ اس سلسلہ میں مذہبی طبقہ کو بھی سماجی سرگرمیوں کا حصہ بنایاجاناچاہیے تا کہ وہ عوام کو اس سلسلہ میں آگاہی فراہم کرسکیں۔

انصاف کی فراہمی کے مسائل

ضلع لودھراں اپنی ساخت کے لحاظ سے دیہی نوعیت اور ثقافت کا شہر اور ضلع ہے، جس کی وجہ سے شہر اور ضلع بھر میں تھانہ کچہری کی سیاست بہت ہوتی ہے۔ دیہی ثقافت کے حامل شہروں میں چھوٹے چھوٹے جھگڑے بڑی نوعیت کی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے سماجی تشدد میں مسلسل اضافہ رہتا ہے۔

یہاں سیاست بھی روایتی طرز کی ہے، جو تھانہ کچہری پر زیادہ یقین رکھتی ہے اور اس سلسلہ میں سرکاری اہلکاروں پر مسلسل اثر انداز ہونے کی کوششیں ہوتی رہتی ہیں جس میں عام شہری پس جاتا ہے۔

حل

ضروری ہے کہ تھانہ کچہری کی سیاست کی حوصلہ شکنی کی جائے اور قانونی معاملات میں سیاسی اور مقامی طور پر اثر اور طاقتور لوگوں کی مداخلت فی الفور بند کی جائے۔ شہریوں اور سماجی تنظیموں کو چاہیے کہ پولیس کی تربیت کی جائے تا کہ جھوٹے مقدمات درج ہونے کے معاملات پر قابو پایا جاسکے اور اس سلسلہ میں بین الاقوامی امدادی اداروں کی بھی مدد حاصل کی جائے۔

تھانہ اور کچہری کے نظام سے روزانہ دیہاڑی لگانے والے ٹاؤٹس کا خاتمہ کیا جائے تا کہ کسی قسم کے غیر قانونی کام کو کوئی جواز نہ مل سکے۔ اس کے علاوہ، تھانہ کلچر میں تشدد کا تدارک کیا جانا چاہیے اور یہ بھی پولیس کی تربیت سے ممکن ہو سکتا ہے۔

فنی مہارت کا فقدان

اس ضلع میں سرکاری تعلیمی ادارے جدید خطوط پر بالکل بھی استوار نہیں ہیں اور ایسے تعلیمی مراکز کی کمی ہے، جو بالخصوص نوجوانوں اور خواتین میں فنی تعلیم کو فروغ دے رہے ہوں۔ یہاں کے نوجوانوں کی اک بہت بڑی اکثریت ڈیجٹیل تعلیم اور ہنر سے بے خبر ہیں۔ انٹرنیٹ کی دُنیا میں جو تبدیلیاں آچکی ہیں، یہاں کے نوجوانوں کو متعارف کروانے کی ضرورت ہے جس کے لیے مقامی سطح پر کسی قسم کی کوئی حکمت عملی یا عمل ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔

حل

مقامی، علاقائی اور بین الاقوامی امدادی تنظیمات کے ساتھ مل کر اس بات کی ضرورت ہے کہ نوجوانوں کو ڈیجیٹل مہارتوں سے آگاہی کے پروگرام شروع کیے جائیں۔ اور ایسے پروگراموں میں خواتین کو خصوصی ترجیح دی جائے تا کہ وہ خواتین جو پڑھ لکھ چکی ہیں، ان کے لیے معاش کے دروازے کھلیں اور وہ اک پیداواری سماجی و معاشی زندگی گزارنے کے قابل ہو سکیں۔

اس سلسلہ میں ضلعی حکومت کو نجی شعبہ اور غیر سرکاری تنظیمات کے ساتھ مل کر فنی تعلیمی مراکز قائم کرنے کی ضرورت ہے جن میں آن لائن کاروبار کے مواقع سے روشناس کروایا جائے۔

اس حوالے سے کمپیوٹرز ٹیکنالوجی سینٹرز کے قیام کو فروغ دیا جائے تاکہ ای-لرننگ پروگرامز میں نوجوانوں اور خواتین کی اہلیت کے معیار میں ترقی کو یقینی بنایا جاسکے۔ نوجوانوں اور خواتین کو اس پروگرام کے ذریعے چھوٹے کاروبار قائم کرنے اور انہیں انٹرنیٹ پر لے کر جانے، اور چلانے کی تربیت فراہم کی جانی چاہیے۔

ثقافت کا فروغ

دیہی ضلع ہونے کی وجہ سے مقامی ثقافتوں کے وجود کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ مقامی کھیل، تفریحات اور کلچر کی ترویج و ترقی سے اس ضلع میں خوب صورت اور انسان دوست پُرامن سرگرمیوں کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ پچھلے کئی عشروں سے ایسی تقریبات میں مسلسل کمی دیکھنے کو مل رہی ہے جو اچھا شگن نہیں۔

حل

ضلع لودھراں میں ضلعی آرٹس کونسل کا قیام عمل میں لایا جائے اور اس سلسلہ میں ضلعی حکومت پر مسلسل سماجی دباؤ رکھا جائے تاکہ یہ کام جلد از جلد پایہ تکمیل کو پہنچ سکے۔ پورے ضلع علمی و ثقافتی سرگرمیوں کو سرکاری سرپرستی میں عام کیا جائے اور اس میں نوجوانوں کو صحتمند طریقے سے شامل ہونے کی دعوت بھی دی جائے۔

پرفارمنگ آرٹس کے مقابلوں کا انعقاد کیا جائے اور مقامی ٹیلنٹ کو ضلعی آرٹس کونسل کے ذریعے نکھارا جائے۔ ضلع کی مقامی ثقافت اور قدیم کھیلوں کو بچایا جائے اور اس ضمن میں صوبائی محکمہ ثقافت کو کردار ادا کرنا چاہیے۔

ڈیرہ غازی خان

تعارف

تاریخ کے مطابق 15 ہویں صدی عیسوی میں بلوچ قبائل نے اس شہر کو آباد کیا اور ایک بلوچ سردار میر حاجی خان میرانی نے اپنے بیٹے غازی خان کے نام پر دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر ڈیرہ غازی خان کی بنیاد رکھی۔ 1887 میں ڈیرہ غازی خان دریائے سندھ کے کٹاؤ کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ اس وقت یہ شہر اپنی بنیاد کے وقت کے موجودہ مقام سے 15 کلومیٹر مشرق میں واقع تھا۔

یہاں کی اکثریت آبادی سرائیکی زبان بولتی ہے جبکہ ارد گرد کے کچھ علاقوں میں سرائیکی کے ساتھ ساتھ بلوچی زبان بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے، لغاری علیانی، عیسانی، کھوسہ، مزاری، لنڈ، گورچانی، کھیتران، بزدار، اور قیصرانی، شہانی بلوچ، یہاں کے بڑے قبائل ہیں۔

1982ء میں ڈیرہ غازی خان ڈویژن بنا۔ ڈیرہ غازی خان کی چار تحصیلیں ہیں۔ ڈیرہ غازی خان کی سرزمین معدنی وسائل سے مالا مال ہے ارد گرد کا علاقہ سنگلاخ پہاڑوں کے باعث ناقابل کاشت ہے، علاقے کے نوجوانوں کی اکثریت روزگار کی تلاش میں خلیجی ممالک کا رُخ کرتی ہے، تونسہ کے علاقے سے گیس اور تیل نکلتا ہے، علاقے میں یورینیم کے ذخائر موجود ہیں۔ الغازی ٹریکٹر پلانٹ، فیٹ ٹریکٹر اور ڈی جی سیمنٹ، اس علاقے کی پہچان ہے۔

یہ بہت گرم اور خشک آب و ہوا کا شہر ہے، مگر اس ضلع میں حیرت انگیز طور پر کوئٹہ روڈ پر تقریباً 85 کلومیٹر کے فاصلے پر جنوبی پنجاب کا سرد ترین تفریحی مقام فورٹ منرو ہے۔

ضلع ڈی جی خان کی 1998ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 1,643,118 نفوس پر مشتمل تھی۔ جبکہ 2017 کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 2,872,201 ریکارڈ کی گئی۔ اس شہر کی آبادی تیزی سے بڑھی ہے۔ جس سے کئی طرح کے مسائل نے جنم لیا۔ ان مسائل پر قابو پایا جا سکتا ہے اگر محکمہ بہبود آبادی کی کارکردگی کو بہتر بنایا جائے اور اس سلسلہ میں مقامی سطح پر بڑھتی آبادی کے نقصانات سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔

ڈی جی خان میں قومی اسمبلی کے 4 حلقے ہیں۔ این اے 189 تا، 192، جبکہ صوبائی اسمبلی کے 8 حلقے ہیں۔ پی پی 285 تا 292۔

ڈیرہ غازی خان کے سیاسی خاندان

لغاری خاندان

سردار محمد خان 1970 میں ایم پی اے تھے اور ان کے بیٹے سردار فاروق احمد لغاری سابق صدر اور بھائی جمال لغاری سابق سینیٹر 2006-2012 رہے۔ ان کے صاحبزادے اویس لغاری ایم پی اے، سردار فاروق کے کزن سردار جعفر لغاری ایم این اے، محمد

خان لغاری ایم پی اے اور محسن لغاری ایم پی اے اور صوبائی وزیر رہے۔(میاں جعفر لغاری، ایم یوسف لغاری، کرنل رفیق لغاری، مقصود لغاری) قریبی رشتہ دار اور سبھی جانی پہچانی شخصیات سابق ایم این اے / ایم پی اے رہے ہیں۔

کھوسہ خاندان

سردار ذوالفقار علی کھوسہ 2008 میں ایم پی اے اور ان کے بیٹے دوست محمد کھوسہ 2008 میں ایم این اے اور سائف الدین کھوسہ 2008 میں ایم پی اے تھے۔ذوالفقار کھوسہ گورنر پنجاب رہے۔ ذوالفقار کے چچا عطا محمد خان کھوسہ 1970 میں ایم پی اے تھے۔ ذوالفقار کے کزن امجد فاروق کھوسہ ایم این اے اور محسن عطا کھوسہ ایم پی اے رہے۔

قیصرانی خاندان

سردار منظور احمد قیصرانی 1954 میں ایم پی اے اور ان کے بیٹے سردار ظہور احمد قیصرانی 1977 میں ایم پی اے تھے، ظہور کے بیٹے میر بادشاہ قیصرانی 2013 میں ایم پی اے تھے اور جعلی ڈگری پر نااہلی کے بعد ان کی اہلیہ شمعونہ عنبرین ان کی نشست پر ایم پی اے بنیں۔نااہلی کے بعد ان کے کزن سردار ممتاز احمر 2013 میں ایم پی اے بن گئے۔

خواجہ خاندان

خواجہ غلام سلیمان 1972 کے الیکشن میں ایم پی اے تھے اور ان کے رشتہ دار خواجہ غلام معین الدین 1985 میں ایم پی اے تھے۔ معین کے رشتہ دار خواجہ کمال الدین انور 1997 میں ایم این اے تھے اور کمال کے بیٹے خواجہ شیر از محمود ایم این اے تھے۔ اسی لڑی میں جب کہ شیر از محمود کے کزن خواجہ محمد ایم پی اے تھے۔

یہاں 2018 کے انتخابات میں سردار عثمان خان بزادر صوبائی سیٹ پر کامیاب ہو کر وزیرِ اعلیٰ پنجاب بن گئے۔اسی طرح زرتاج گل ایم این اے بن گئیں۔یہ وزیرِ مملکت برائے ماحولیاتی آلودگی ہیں۔

صحت کے مسائل

ڈی جی خان ڈویژن کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر یہاں سرکاری سطح پر ایسا کوئی ہسپتال نہیں، جس کو انفرادیت حاصل ہو اور دیگر اضلاع جو اس ڈویژن میں آتے ہیں، وہاں آکر علاج کی سہولت سے مستفید ہو سکیں۔ مقامی افراد میں گردوں کے امراض عام ہیں، اس کے ساتھ ساتھ دانتوں اور ہڈیوں کے امراض میں بھی سال بہ سال اضافہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ صوبہ پنجاب کا دور دراز کا علاقہ ہونے کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صوبائی حکومت کا اس ضلع پر اتنا فوکس موجود نہیں اور اس وجہ سے ضلعی ہیڈ کوارٹر کے ساتھ ساتھ ضلع کے دور دراز علاقوں میں صحت کے مسائل بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ڈی جی خان شہر میں تقریباً 32 ہسپتال موجود ہیں، مگر ان میں

نجی ہسپتالوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ اسی طرح پورے ضلع میں صرف 34 ڈسپنسریز ہیں، 11 صحت کے دیہی مراکز جبکہ بنیادی صحت کے مراکز کی تعداد صرف 54 ہے۔ اس کے علاوہ پورے ضلع میں سرکاری سطح کے بڑے ہسپتال صرف 6 ہیں۔ یہ تعداد بہت کم ہے۔

حل

سرکاری سطح پر معیاری ہسپتال بنائے جائیں، جو ہسپتال موجود ہیں، اُن کی حالت مزید اور بہت ہی زیادہ بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ سرکاری ہسپتالوں میں جدید آلات و مشینری موجود تو ہے، مگر اکثر خراب رہتی ہے اور مریضوں کے فائدے کے لیے استعمال نہیں ہوتی۔ مقامی سرگرم افراد کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ضلعی محکمہ صحت کے ساتھ مل کر عوام کی طبی فلاح و بہبود پر سنجیدہ کوششیں کی جائیں اور اس سلسلہ میں سیاسی رہنماؤں کی مدد حاصل کی جائے۔ حکومت پنجاب کے اعداد و شمار ہی یہ بات بتائے دیتے ہیں کہ ضلع میں صحت کی سہولیات کی تعداد میں شدید اور تیز ترین اضافے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ضلعی و صوبائی حکومتیں جلد از جلد عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کریں۔

شہریوں کا خیال ہے کہ صحت کی سہولیات کی اس تعداد کو تیزی سے دو گنا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ضلع کے عوام کو صحت کے مسائل سے چھٹکارا مل سکے۔

اَمن و امان کی صورتحال

ڈیرہ غازی خان قبائلی انداز کا حامل ضلع ہے۔ یہاں کچے کا علاقہ جرائم پیشہ افراد کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ یہاں وقتاً فوقتاً مقامی پولیس اور دیگر حکومتی ملیشیا فورس آپریشنز کرتی رہتی ہیں، مگر مستقبل بنیادوں پر امن و امان کی مسئلہ کا کوئی حل تلاش نہیں کیا جاتا۔ امن و امان بھی اک وجہ ہے کہ سیاحت کا پوٹینشل ہونے کے باوجود یہاں لوگ بہت کم تعداد میں آتے ہیں۔

حل

تھانہ و کچہری کے ادارہ جات کو مضبوط کیا جائے، اور تھانوں کو جدید سہولیات فراہم کی جائیں جب کہ بہترین پولیس آفیسر تعینات کیے جائیں تاکہ ضلع کے Settled اور بندوبستی علاقہ میں بھی امن قائم ہو سکے۔ تھانہ و کچہری کے معاملات میں سیاسی مداخلت ختم کی جائے، اور جرائم پیشہ افراد کی پشت پناہی کرنے والے بااثر طبقات اور افراد کو قانون کے کٹہرے میں لایا جائے۔ رپورٹ کرنے کے حوالے سے یہاں مقامی صحافیوں پر بھی دباؤ رہتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ صحافیوں کو سیفٹی اور سیف رپورٹنگ کی تربیت دی جائے تاکہ وہ امن و امان کے معاملات میں سیاسی و انتظامی بدنظمیوں پر بھی رپورٹ کر سکیں اور عوام کو آگہی فراہم کر سکیں۔ اس سلسلہ میں غیر سرکاری تنظیموں کو آگے بڑھنا چاہیے۔

تعلیم کے مسائل

یہاں کے تعلیمی نظام کو ویسی ہی مشکلات ہیں، جس نوع کی مشکلات قبائلی ایریا میں تعلیمی نظام کو ہوتی ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ سٹر کچرل مسائل بھی ہیں۔یونیورسٹی تو ہے، مگر فیکلٹی پوری نہیں اور دور دراز کے علاقوں کے اساتذہ کو آمدورفت کے مسائل کا سامنا رہتا ہے۔اس کے علاوہ یونیورسٹی میں سیاسی مداخلت کا مسلسل رجحان رہتا ہے۔پورے ضلع میں صرف 17 کالجز ہیں اور ان میں سے گو کہ 10 پوسٹ گریجویٹ سہولیات رکھتے ہیں، مگر تعلیم کا معیار ویسا نہیں کہ جیسا ہونا چاہیے۔غربت کی وجہ سے یہاں بہت سارے خاندان اپنے بچوں کو یا تو سکولوں میں داخل ہی نہیں کرواپاتے، یا پھر انہیں پرائمری یا مڈل کے درجے کے آس پاس ہی تعلیم سے ہٹا لیتے ہیں۔یہاں کا سکولز ڈراپ آؤٹ ریٹ تقریبا 50 فیصد سے بھی زیادہ ہے جس کی وجہ سے مقامی طور پر جدید خیالات کا ارتقا تقریبا جمود کا شکار ہو چکا ہے۔

حل

یونی ورسٹی میں سٹر کچرل مسائل کو حل کیا جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ یونیورسٹی میں کسی قسم کی کوئی سیاسی مداخلت نہ ہونے پائے تا کہ تعلیمی معیار میں بہتری ممکن ہو سکے۔اس سلسلہ میں اساتذہ کی تعداد کو پورا کرنے کی ضرورت ہے۔نئے تعلیمی ادارے بنائیں جائیں اور ان نئے تعلیمی اداروں میں خواتین کے کالجز کی تعداد میں گونا گوں اضافے کی اشد ضرورت ہے۔فنی تعلیم کے ادارے بھی چونکہ موجود نہیں تو فنی تعلیم کی ترقی وترویج کے لیے خصوصی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔اس سلسلہ میں مقامی بااثر افراد کو صوبائی حکومت پر سیاسی و سماجی دباؤ کے ذریعے ڈی جی خان ضلع کے لیے فنی تعلیم کی ترقی کے لیے خصوصی اقدامات کروانے کی ضرورت ہے۔

زراعت کے مسائل

یہاں زراعت کو سیلاب دو انداز سے متاثر کرتا ہے۔دریائے سندھ میں آنے والی طغیانی سے فصلوں، املاک اور جانوروں کو نقصان پہنچتا ہے۔اس کے علاوہ شدید بارشوں سے کوہ سلیمان پہاڑی سلسلے سے پانی نیچے آتا ہے تو تباہی پھیلا دیتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہاں بھی زراعت کو روایتی نوعیت کے مسائل کا سامنا ہے جس میں پانی کی دستیابی، زرعی ادویات کا جعلی نکل آنا، محکمہ زراعت کے افسران کا مقامی کاشتکاروں سے تعاون نہ کرنا، جس کی وجہ سے فصلوں کی کاشت اور پھر ان کی کٹائی کے مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں۔

حل

دریائی علاقوں میں بند باندھے جائیں۔پہاڑوں سے آنے والے پانی کے راستے میں مصنوعی رکاوٹیں کھڑی نہ کی جائیں تاکہ وہ اپنے فطری بہاؤ میں بہہ کر دریا میں چلا جائے۔بلکہ اس طریقے سے چھوٹے پیمانے کے ڈیمز بنائے جائیں جس میں پانی کو ذخیرہ تو کیا جا سکے

مگر مقامی آب وہوا اور صدیوں پرانی بود وباش پر کوئی منفی اثر نہ پڑنے پائے۔ جعلی زرعی ادویات بیچنے والوں کی فوری سرکوبی کی جائے، اس سلسلہ میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اپنا کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس سے زراعت کو بہت نقصان ہو رہا ہے۔ زراعت کے پیشہ کو جدید سہولیات بہم پہنچانے کے لیے محکمہ زراعت کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور مقامی طور پر منتخب قیادت اس معاملہ میں اپنا کردار ادا کرے۔

خواتین اور فرسودہ رسومات

یہاں کی خواتین قبائلی روایات کی بھینٹ چڑھتی رہتی ہیں۔ یہاں کی خواتین کی کم عمری میں شادیاں بھی ہوتی ہیں اور یہ خواتین جدید تعلیم سے آراستہ بھی نہیں۔ خواتین کے خلاف سماجی اور قبائلی تشدد بہت عام ہے اور بعد از تشدد خواتین کی دادرسی کا بھی کوئی خاطر خواہ انتظام موجود نہیں۔ سماجی اور قبائلی معاشرے کا سٹرکچر کچھ ایسا ہے کہ خواتین کے حقوق کے معاملات پر کوئی گفتگو بھی موجود نہیں جب کہ مزید عجب بات یہ کہ خواتین کے حقوق پر گفتگو شروع کرنے والے اداروں کو ضلعی حکومت کی جانب سے ایک تو کام کرنے کے اجازت نامے نہیں مل پاتے جب کہ سماجی طور پر بھی ان کے خلاف بہت سارے سازشی نظریات گردش کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے خواتین سے جڑے ہوئے معاملات ابھر کر نہ صرف سامنے نہیں آ پاتے، بلکہ ان پر کسی قسم کی کوئی بات چیت بھی نہیں ہو سکتی۔

حل

خواتین کو اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جائے۔ خواتین کو باشعور بنانے کے لیے آگاہی مہم اور تربیت کاری کی جائے۔ کم عمری کی شادیوں پر سختی سے پابندی کی جائے اور اس کے نقصانات سے عام لوگوں کو آگاہی دے جائے۔ وٹہ سٹہ کی شادی کی حوصلہ شکنی کی جائے اور اس کلچر کا خاتمہ کرنے کے لیے خواتین کو بااختیار بنایا جائے کیونکہ اس رسم کی وجہ سے خواتین پر تشدد کے واقعات عام دیکھنے کو ملتے ہیں۔ خواتین کو روزگار کے مواقعوں سے جوڑا جائے اور اس سلسلہ میں بالخصوص پڑھی لکھی نوجوان بچیوں کو پیشہ وارانہ مہارتوں سے لیس کیا جانا چاہیے۔ مقامی غیر سرکاری ایکٹوسٹس کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ضلعی حکومت کے ساتھ کام کرنے کے لیے تعاون کی اک فضا مسلسل قائم رکھا کریں تاکہ وہ کام کر سکیں، انہیں مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑے اور اس کے ساتھ ساتھ، خواتین کو بھی فائدہ حاصل ہو۔

پینے کے صاف پانی کا مسئلہ

شہر میں زیر زمین پانی کافی کڑوا ہے۔ پینے کا صاف پانی ڈیرہ غازی خان کا ایک سنگین مسئلہ ہے۔ شہر میں پینے کے صاف پانی کی فراہمی کے لیے شہر سے کم و بیش دس کلومیٹر دور پمپ لگے ہوئے ہیں جہاں سے پانی پائپوں کے ذریعے فراہم کیا جاتا ہے۔ پمپ اکثر خراب رہتے ہیں اور پھر پائپ لائنوں کے پھٹ جانے سے سیوریج ملا پانی پینے کو ملتا ہے۔ شہریوں کی اکثریت گندے پانی کی وجہ سے گردوں

اور دیگر امراض کا شکار ہو رہی ہے۔ پینے کے صاف پانی کی فراہمی کے لیے سابق صدر جنرل پرویز مشرف نے لاکھوں روپے کی لاگت سے 11 اگست 2000 کو واٹر پیور لیفکیشن پلانٹ کا افتتاح کیا اور اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اس کے بعد تین اور پمپس بھی چالو کیے گئے جنہیں مشرف واٹر پمپس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مگر محکمہ پبلک ہیلتھ، تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن کی عدم توجہی کی بنا پر پانی صاف کرنے کے یہ پلانٹ بے کار ہو رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے پانی کے مسائل روز بروز بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

حل

صاف پانی کے مزید پمپس لگائے جائیں اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ان کی مرمت اور دیکھ بھال بھی پیشہ وارانہ معیار کی ہو تاکہ شہریوں کو پانی کے مسائل سے ہر ممکن نجات مل سکے۔ محکمہ پبلک ہیلتھ کو مزید فعال کیا جانا چاہیے اور اس سلسلہ میں غیر سرکاری تنظیمیں آگے بڑھ کر اپنا کردار ادا کریں۔ اس کے علاوہ، مقامی تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشنز کو بھی سرگرمی سے کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کے ماتحت متعلقہ محکمہ کی کارکردگی کو بہتر کیا جائے۔

بہاول پور

تعارف

نواب صادق محمد خان اول عباسی کے بیٹے نواب بہاول خان عباسی اول نے 1774ء میں دریائے ستلج کے جنوب میں 3 میل کے فاصلے پر ایک نئے شہر بہاول پور کی بنیاد رکھی اور ریاست کے وسط میں ہونے کی وجہ سے اسے ریاست کا دار الخلافہ قرار دیا۔ یہ شہر ملتان سے تقریبا90 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

بہاولپور میں زیادہ تر لوگوں کا پیشہ زراعت ہے۔ یہاں پر اگائی جانے والی اہم فصلوں میں گندم، گنا، کپاس، چاول اور سورج مکھی وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں پر بہت سے پھلوں کے باغات موجود ہیں۔ پھلوں میں آم، کھجور اور امرود ایسے پھل ہیں جو بیرون ملک بھیجے جاتے ہیں۔ سبزیوں میں پیاز، ٹماٹر، بند گوبی اور آلو کثرت سے اگائے جاتے ہیں۔

بہاولپور میں بہت سی تعلیمی ادارے قائم ہیں۔ جن میں گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونیورسٹی، قائداعظم میڈیکل کالج اور اسلامیہ یونیورسٹی اہم ہیں۔ اس شہر کی شرح خواندگی بہت زیادہ ہے۔ اس وجہ سے ملک بھر سے طالب علم یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں۔

ضلع بہاول پور کی 1998ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی 2,433,091 نفوس پر مشتمل تھی۔ جبکہ 2017 کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 3,668,106 ریکارڈ کی گئی۔ اس شہر کی آبادی تیزی سے بڑھی ہے۔ جس سے کئی طرح کے مسائل نے جنم لیا۔ اس مسئلے کو حل کیا جاسکتا ہے اگر محکمہ فیملی پلاننگ کی کارکردگی کو بہتر بنایا جائے۔ مقامی سطح پر بڑھتی آبادی کے نقصانات سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ چھوٹی عمر کی شادیوں پر مکمل پابندی لگائی جائے۔ وسائل کے مطابق بچوں کی تعداد کی آگاہی کو عام کیا جائے۔

بہاول پور ضلع میں قومی اسمبلی کے 5 حلقے ہیں۔ این اے 170 تا، 174 جبکہ صوبائی اسمبلی کے 10 حلقے ہیں۔ پی پی 245 تا 254۔

صحت کے مسائل

اگرچہ اس شہر میں وکٹوریہ ہسپتال جیسا بہترین ہسپتال موجود ہے۔ لیکن بڑھتی آبادی کی وجہ سے یہ ہسپتال مریضوں کی تعداد کی وجہ سے دباؤ میں رہتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ساتھ ضلع اور شہر میں صحت کی سہولیات اس کے مطابق نہیں بڑھیں جس کی وجہ سے صحت کے مسائل عام ہیں اور مریضوں کو علاج معالجے کی سہولیات کے لیے بسا اوقات شہر اور ضلع سے باہر سفر کرنا پڑتا ہے: کبھی ملتان تو کبھی لاہور۔ ضلع میں بڑے (کمپلیکس) ہسپتالوں کی کل تعداد صرف 12 ہے جبکہ روزمرہ کے طبی معاملات سے نبٹنے کے لیے ڈسپنسریوں کی تعداد صرف 67 ہے۔ صحت کے دیہی مراکز کی تعداد 13 اور بنیادی صحت کے مراکز صرف 84 ہیں۔ یہ تعداد کم از کم دوگنی کرنے کی ضرورت ہے۔

حل

بہاول پور میں 84 بنیادی اور 13 دیہی مراکز صحت قائم ہیں۔ ان میں خواتین کے لیے الٹرا ساؤنڈ سمیت زچگی کی مناسب سہولیات کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ بہاولپور میں پہلے سے منظور چلڈرن کمپلیکس منصوبے کا قیام اور تعمیر لازمی کی جائے۔ پہلے سے منظور شدہ زچہ و بچہ کمپلیکس کی تعمیر کو یقینی بنایا جائے تاکہ مقامی خواتین کی صحت کے دیرینہ مسائل کا حل سامنے آ سکے۔

روہی چولستان میں مراکز صحت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ بہت بڑے روہی چولستان میں بنیادی صحت کے صرف 7 مراکز ہیں۔ صحت کے دیہی مراکز میں کتے کاٹے کی ویکسین کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے کیونکہ یہ مسائل ضلع کے دور دراز علاقوں میں اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس بات کی بھی اشد ضرورت ہے کہ تحصیل ہیڈ کوارٹر کی سطح پر گردوں کے امراض، بالخصوص ڈائلائسز کی سہولت کو یقینی بنایا جائے۔

تعلیم کے مسائل

بہاول پور ایک تاریخی شہر ہے۔ سرائیکی بیلٹ کا یہ ایک اہم ضلع ہے۔ اس میں اعلیٰ تعلیمی ادارے موجود ہیں۔ مگر تعلیم کے میدان میں اس شہر کے باسیوں کو مختلف قسم کے مسائل کا سامنا رہتا ہے۔ اس کی 109 یونین کونسلز ہیں۔ جبکہ صرف 15 میں گرلز ہائر سیکنڈری سکول اور 12 میں بوائز ہائر سیکنڈری سکول موجود ہیں۔ اسی طرح 109 یونین کونسلز میں 86 میں گرلز ہائی سکول اور 23 میں بوائز ہائی سکول موجود ہیں۔

روہی چولستان میں 3 لاکھ افراد کے لیے صرف 2 گرلز ہائی سکول اور بوائز کے لیے بھی 2 ہائی سکول ہیں۔ نوجوانوں کے لیے ٹیکنیکل ایجوکیشن کا بھی کوئی خاص بندوبست نہیں، اور گو کہ یہاں کم از کم شہر کی حد تک خواتین میں تعلیم کا شعور بہت مضبوط ہے، مگر اعلیٰ تعلیم کے بعد شہر اور ضلع میں خواتین کے لیے کسی قسم کے پیشہ وارانہ مواقع تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔

حل

یونین کونسل سطح پر ہائر سیکنڈری سکولوں کی تعداد میں اضافہ ناگزیر ہے۔ کیونکہ 23 یونین کونسلز ایسی ہیں جس میں کوئی ہائی سکول ہی نہیں، وہاں ہائی سکول بنائے جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ روہی چولستان میں آبادی کے لحاظ سے سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری سکول تعمیر کیے جائیں۔ نوجوانوں، بالخصوص، خواتین کے لیے فنی تربیت اور اعلیٰ تعلیم کے مزید مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔

نوجوانوں کو پیشہ وارانہ صلاحیتوں سے مالا مال کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں غیر سرکاری تنظیموں کو ضلعی حکومت اور تعلیمی اداروں کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔

زمینوں کی الاٹ منٹ کے مسائل

اس شہر میں بھی زمینوں کے الاٹ منٹ کے دیرینہ مسائل ہیں جو کسانوں اور زمین داری سے جڑے افراد کی ذہنی اور مالی اذیت کا سبب ہیں۔ بہت ساری زمینیں ایسی ہیں جو یہاں کے مقامی و قدیمی باشندوں نے صدیوں سے کاشت کی ہیں، مگر ان کا مناسب ریکارڑ موجود نہ ہونے کی وجہ سے ان پر بااثر افراد اور طاقتور اداروں کی اجارہ داری بڑھتی چلی جارہی ہے۔

حل

روہی چولستان میں زمینوں کی عارضی کاشت کے لیے الاٹ منٹ مقامی لوگوں کو کی جائے کیونکہ غیر مقامی لوگوں کی مسلسل آباد کاری اور زمینوں کی الاٹمنٹ سے یہاں سماجی مسائل میں مسلسل اضافہ ہو رہاہے۔ اس سلسلہ کو کسی سوِل قانون کے تابع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان معاملات میں شفافیت کے ساتھ ساتھ احتساب کا عمل بھی یقینی ہو سکی۔ نیز زمینوں کی الاٹ منٹ میں سیاسی مداخلت کا خاتمہ کیاجائے۔

اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ روہی چولستان کا وسیع رقبہ قطر، دوبئی، ابوظہبی کے امراکو شکار پر دینابند کیاجائے اور مقامی لوگوں کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنے مویشیوں کی چراگاہوں میں اضافہ کر سکیں۔ اسی طرح روہی چولستان کے علاقے میں ریٹائرڈ فوجیوں کو زمینیں الاٹ کرنے کا سلسلہ ختم کیاجائے۔

پانی کا مسئلہ اور سیوریج

یہاں پینے کا صاف پانی ایک مسئلہ ہے۔ پانی کی آلودگی کی ایک وجہ سیوریج کا ناقص نظام بھی ہے۔ سیوریج کا پانی صاف پانی میں مکس ہونے کی شکایت سامنے آتی رہتی ہیں۔ زیر زمین بھی پانی کی سطح مسلسل گر رہی ہے۔ دیکھنے میں آیاہے کہ ضلعی حکومت نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی اور صوبائی حکومت بھی اس معاملہ سے گویالاتعلق ہی ہے۔

حل

بہاولپور کی 109 یونین کونسلز میں واٹر فلٹریشن پلانٹس کا قیام ضروری ہے۔ بہاولپور شہری ایریا میں جو صاف پانی کے پلانٹ میں ہیں اُن میں 6 خراب حالت میں ہیں، ان کو ٹھیک کر کے شہری آبادی کو صاف پانی مہیا کیاجائے۔ سیوریج کے نظام کو درست کیاجائے اور جہاں سیوریج کے پائپ پھٹ چکے ہیں اور یہ پانی پینے کے صاف پانی میں شامل ہو رہاہے، وہاں ایسے معاملات کا فی الفور تدارک کیا جائے۔

روہی چولستان کی آبادی 3 لاکھ افراد پر ہے، یہاں محض چار واٹر سپلائی لائنز ہیں، یہ ناکافی ہیں اور یہ 18 سال قبل بچھائی گئی تھیں، ضرورت اس امر کی ہے، کہ ان کی تعداد میں اضافہ آبادی کے تناسب کے ساتھ کیاجائے۔

مقامی لوگوں کو اس معاملہ میں ضلعی حکومت اور صوبائی حکومت پر دباؤ بڑھانے کی ضرورت ہے جس کے لیے مقامی اور بین الاقوامی ترقیاتی و غیر سرکاری ادارے آگے بڑھیں اور ایسے معاملات میں شہریوں کو بہتر ایڈووکیسی کی تربیت فراہم کریں تاکہ مستقبل بنیادوں پر ایسے سماجی مسائل کا حل ممکن ہو سکے۔

روزگار کے مواقع کی شدید کمی

یہاں روزگار کے مواقع آبادی کے تناسب سے بہت کم ہیں۔ روزگار کے لیے نئے مواقع پیدا کرنا وقت کی اشد ضرورت ہے۔ بڑی صنعتیں نہ ہونے کے برابر ہیں جبکہ تجارت کی نوعیت بھی بے حد علاقائی ہے۔ جس حساب سے نوجوان ہر برس تعلیم یافتہ ہو کر پیشہ وارانہ میدان میں نکلتے ہیں، اس حساب سے یہاں روزگار کے مواقع مہیا نہیں ہیں۔ بیروزگاری کی وجہ سے یہاں سماجی مایوسی اور بسا اوقات مذہبی تشدد بھی دیکھنے کو مل جاتا ہے جس میں نوجوان عموماً پیش پیش دیکھے جاتے ہیں۔

حل

یہاں کے نوجوانوں کو جو پڑھے لکھے ہیں، سرکاری ملازمتوں میں متناسب نمائندگی دی جائے۔ چھوٹی سرکاری ملازمتوں میں سیاسی مداخلت کم کی جائے۔ صوبائی اور وفاقی حکومتوں پر دباؤ میں اضافہ کیا جائے تاکہ مقامی طور پر صنعتکاری کو فروغ حاصل ہو، جیسا کہ ملتان اور لاہور میں ہے۔ ضلعی حکومت کو اس سلسلہ میں صنعتی میلوں کا انعقاد کرنا چاہیے اور اس سلسلہ میں بہاولپور چیمبر آف کامرس کا تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے۔

نہری پانی سے جڑے مسائل

بہاولپور زراعت کے حوالہ سے بہت ہی اہم ضلع ہے۔ یہاں نہری نظام ہے، مگر پنجاب کے دیگر دور دراز کے شہروں میں نہری پانی کی تقسیم کے حوالے سے جو مسائل ہوتے ہیں، وہ یہاں کے کاشت کاروں کو بھی ہیں۔ گرمیوں اور سردیوں کے عروج کے موسم میں یہاں Tail-Ends پر موجود کاشتکاروں کو پانی کی مسلسل عدم دستیابی رہتی ہے جس کی وجہ سے سال بہ سال فصلوں کی کاشت اور ان کی مقدار میں کمی واقع ہو رہی ہے جو اپنی سطح پر زرعی بیروزگاری اور سماجی مسائل پیدا کر رہی ہے۔

حل

پنجاب میں نہری پانی کی منصفانہ تقسیم کو یقینی بنایا جائے اور اس میں بہاول پور کا حصہ پورا رکھا جائے۔ بہاولپور گندم، کپاس، گنا، سبزیات اور پھلوں میں بہترین پیداوار کا حامل ضلع ہے، اس ضلع میں کاشت ہونے والے فصلوں کے تناسب سے پانی کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ پانی چوری کے واقعات کی محکمہ نہر روک تھام کرے۔

نہری پانی کی تقسیم میں سیاسی مداخلت کا خاتمہ کیا جائے۔ ضلعی حکومت اور مقامی طور پر منتخب شدہ ممبران صوبائی اسمبلی کو ضلع کی زراعت کے بحران پر آگاہی فراہم کرنے کے لیے غیر سرکاری اداروں کو اک فعال کردار ادا کرنے کی ضرورت تو ہے، مگر ضلعی حکومت انہیں اکثر الاوقات یہاں کام کرنے کا اجازت نامہ ہی فراہم نہیں کرتی۔ بداعتمادی کی اس فضا کو ختم کیا جانا چاہیے۔

بہاول نگر

مختصر تعارف

بہاول نگر ہندوستان کی تقسیم سے پہلے یہ ریاست بہاولپور کا حصہ تھا۔ اس کی 5 تحصیلیں بہاول نگر مرکزی تحصیل، چشتیاں، ہارون آباد، فورٹ عباس اور منچن آباد ہیں۔ یہ گرم ترین درجہ حرارت والے شہروں میں اس کا شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں گرمیوں میں درجہ حرارت 54 درجہ سینٹی گریڈ سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کا بیشتر دارومدار زراعت سے وابستہ ہے۔ یہاں باسمتی سیلا چاول کی انڈسٹریاں واقع ہیں۔ یہاں کی مشہور غلہ منڈیوں میں بہاول نگر، ہارون آباد ہیں۔ یہاں دریائے ستلج بہتا ہے۔ اس شہر کے بعض علاقوں کے مکینوں کو سیلاب کی آفت کا بھی گاہے بہ گاہے سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ضلع بہاول نگر کی 1998ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی 2,061,447 نفوس پر مشتمل تھی۔ جبکہ 2017 کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 2,981,919 ریکارڈ کی گئی۔ اس شہر کی آبادی تیزی سے بڑھی ہے۔ جس سے کئی طرح کے مسائل نے جنم لیا۔ یہ مسائل کسی حد تک حل ہوسکتے ہیں اگر محکمہ فیملی پلاننگ کی کارکردگی کو بہتر بنایا جائے۔ مقامی سطح پر بڑھتی آبادی کے نقصانات سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ چھوٹی عمر کی شادیوں پر مکمل پابندی لگائی جائے۔ وسائل کے مطابق بچوں کی تعداد کی آگاہی کو عام کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مذہبی طبقہ کے تعاون کو حاصل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

بہاول نگر میں قومی اسمبلی کے 4 حلقے ہیں۔ این اے 166 تا169، جبکہ بہاول نگر میں صوبائی اسمبلی کے 8 حلقے ہیں۔ پی پی 237 تا244ہیں۔

بہاول نگر کے سیاسی خاندان

وٹو فیملی

میاں فدا حسین وٹو 2008، 2013 اور 2018 میں پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ان کے والد میاں نذر محمد نے 1965-69 کے دوران مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے رکن کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ان کے بھائی میاں خادم حسین وٹو 1985-88، 1988-90، 1990-93 اور 2002-07 کے دوران ممبر صوبائی اسمبلی پنجاب رہے اور 2008-13 کے دوران ایم این اے بھی رہے۔ عبدالغفار وٹو نے 2018 میں الیکشن لڑا لیکن ہار گئے۔

چوہدری خاندان

چوہدری عبدالغفور 1988 میں ایم این اے، 1977 اور 1985 میں ایم پی اے منتخب ہوئے۔ ظفر اقبال 2003 میں سینیٹر اور 1990 میں ایم پی اے منتخب ہوئے، ان کے دوسرے بیٹے چوہدری مظہر اقبال بھی 2018 میں ایم پی اے منتخب ہوئے۔

لالیکا خاندان

عبدالستار لالیکا متعدد بار سینیٹر، ایم این اے منتخب ہوئے۔ ان کے بیٹے عالم داد لالیکا 2013 اور 2018 میں ایم این اے منتخب ہوئے۔ عبدالستار لالیکا کے کزن میاں عالم علی لالیکا 1988 میں سینیٹر تھے۔ میاں عالم علی لالیکا کے چھوٹے بھائی میاں امتیاز علی لالیکا ایم پی اے منتخب ہوئے۔ ان کے بھتیجے میاں شوکت علی لالیکا تیسری بار ایم پی اے بیٹھے ہیں، ایک اور بھتیجا میاں محمد علی لالیکا بھی ایم پی اے تھے۔

موہل خاندان

آصف منظور موہل 2008 میں ایم پی اے منتخب ہوئے۔ ان کے والد میاں منظور احمد موہل نے 1972-77، 1977، 1988-90، 1990-93 اور 1993-96 کے دوران پانچ مرتبہ رکن پنجاب اسمبلی کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ڈپٹی سپیکر پنجاب اسمبلی رہے۔

ہوتیانہ فیملی

محمد طارق امین ہوتیانہ 2008 میں ایم پی اے منتخب ہوئے۔ ان کے چچا میاں سلطان محمود ہوتیانہ نے 1937-45 کے دوران ممبر پنجاب قانون ساز اسمبلی کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ان کے ایک اور چچا، میاں نور احمد ہوتیانہ نے 1970-77 کے دوران رکن صوبائی اسمبلی پنجاب کے طور پر خدمات انجام دیں۔

وینس فیملی

محمد عبداللہ وینس 2002 کے عام انتخابات میں ممبر صوبائی اسمبلی پنجاب منتخب ہوئے تھے۔ ان کے والد چوہدری علی اکبر وینس 1988-90 کے دوران ممبر پنجاب اسمبلی رہے تھے۔ 1993-96 کے دوران ممبر قومی اسمبلی اور 2002 میں ضلع ناظم بہاولنگر، 1990 اور 1993 میں ہار گئے۔

صحت کے مسائل

اس شہر کو صحت کے اُنھی طرح کے مسائل کا سامنا ہے، جو دور دراز کے شہروں کو ہوتا ہے۔ ہسپتال بڑے نہیں ہیں، جو ہیں، ان میں جدید ٹیکنالوجی اور ماہر ڈاکٹروں کی کمی کا سامنا ہے۔ ضلع بھر میں موجود طبی سہولیات کے یونٹس کے بارے میں مفید معلومات مہیا نہیں، مگر ضلعی ہیڈ کوارٹر شہر میں تقریباً 14 ہسپتال ہیں جن میں ڈسرکٹ ہیڈ کوارٹر اور تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتال بھی شامل ہیں۔

طبی سہولتوں کے لیے شہری زیادہ تر نجی ہسپتالوں کا رخ کرتے ہیں جو علاقے میں پھیلی غربت کی وجہ سے اکثر الاوقات مریض یا اس کے اہل خانہ کے لیے معاشی طور پر برداشت کرنا مشکل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ صرف 6 بڑے (کمپلیکس) ہسپتال موجود ہیں جبکہ صرف 37 ڈسپنسریز موجود ہیں۔ صحت کے دیہی مراکز صرف 10، جبکہ بنیادی طبی سہولتوں کے مراکز 103 ہیں جو ضلع کے جغرافیائی رقبے کے حوالے سے کم ہیں۔

حل

انفراسٹرکچر کو ٹھیک کرنے کے ساتھ ساتھ ہسپتالوں کو جدید سہولیات دی جائیں۔ ڈاکٹرز اور دیگر اسٹاف کی کمی کو تمام ہسپتالوں، بالخصوص سرکاری ہسپتالوں، میں پورا کیا جائے۔ اسکے ساتھ ساتھ، سرکاری ہسپتالوں کے علاوہ مارکیٹ میں بھی ادویات کی عدم دستیابی کے مسائل رہتے ہیں، ان کو پورا کیا جائے۔ سرکاری ہسپتالوں میں دل، گردوں کے یونٹ قائم کیے جائیں۔ ایم آر آئی اور سٹی سکین جیسے ٹیسٹ کی سہولت کو سرکاری ہسپتالوں میں یقینی بنایا جائے تاکہ مریضوں کو ان تکالیف کے ساتھ دوسرے بڑے شہروں کا رخ نہ کرنا پڑے۔ یہاں جدید لیبارٹریز کی بھی کمی ہے، اس پر توجہ دینے کی فوری ضرورت ہے۔

مذہبی انتہا پسندی کا مسئلہ

یہ شہر بھی مذہبی انتہا پسندی کے زیرِ تسلط ہے۔ یہاں بین المسالکی جھگڑوں کی تاریخ موجود ہے اور ساتھ ہی میں تشدد کے واقعات بھی ماضی میں دیکھنے کو ملتے رہے ہیں۔ یہ ضلع دیہی ثقافت کا آئینہ دار ہے۔ اور یہاں وہی مسائل ہیں، جو دیہی نوعیت کے پسماندہ شہروں میں ہوتے ہیں۔ لوگوں کے پاس جدید تصورات سے جڑنے کے مواقع نہیں، اس لیے روایتی نوعیت کے مذہبی و سماجی تضادات یہاں پائے جاتے ہیں جو اکثر الاوقات سماجی تشدد کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں۔

حل

یہ بہت ضروری ہے کہ غیر جانبدار سماجی کمیٹیوں کا قیام عمل میں لایا جائے، جس میں تمام مسالک کے زعما کو شامل کیا جائے اور جو سارا سال، بالخصوص مذہبی تہواروں کے مواقع پر سماجی امن و امان کو یقینی بنائیں اور اس سلسلہ میں غیر سرکاری تنظیموں کو بھی بھرپور

کردار ادا کرنے کی آزادی دی جائے۔ غیر سرکاری کمیٹیاں بنائی جائیں، جو ضلع، تحصیل اور یونین کونسل سطح پر ہوں، جس میں خواتین کو بھی نمائندگی دی جائے۔

ضلعی سطح پر مدارس کے ساتھ مسلسل کام کیا جائے اور اُ کے ساتھ تعاون کرکے مذہبی و سماجی رواداری و ہم آہنگی پر ورکشاپ کروائی جائیں، اس میں تعلیمی اداروں کو بھی شامل کیا جائے۔ نیز، مذہبی ہم آہنگی اور سماجی ہم آہنگی کے لیے اقلیتوں کو بھی ان تمام سرگرمیوں میں شامل رکھا جائے۔

سرحدی علاقہ جات کی وجہ سے مشکلات اور مسائل

پنجاب کا یہ ضلع سرحدی ضلع ہے۔ اس کی چار تحصیلیں انڈیا کے ساتھ بارڈر رکھتی ہیں۔ اگرچہ اس سرحدی علاقہ میں مسائل کی نوعیت ورکنگ باؤنڈری یا ایل او سی جیسی کبھی نہیں رہی، مگر سرحدی سطح پر جو مسائل ہوتے ہیں، اس کی پرچھائیاں یہاں بھی موجود رہتی ہیں۔

حل

عوام محسوس کرتے ہیں کہ پاکستان و انڈیا کے تعلقات میں پائیداری ضروری ہے تاکہ کم از کم پاکستان کی جانب عوام اپنے تئیں معاشی سرگرمیوں کو بڑھا سکیں۔ اس کے علاوہ، سرحد سے متعلق جو بنیادی آگاہی ہوتی ہے، وہ مقامی لوگوں کے اندر پیدا کی جائے تاکہ کسی قسم کے ناخوشگوار تجربہ یا سانحہ سے بچا جا سکے۔ ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ سرحدی علاقہ کی چولستانی زمینیں مقامی لوگوں کے پاس مالکانہ حقوق نہیں، مالکانہ حقوق ان کو دیئے جائیں۔

تعلیم کے مسائل

یہ شہر تعلیمی سطح پر بھی پسماندہ ہے۔ تعلیمی پسماندگی فنی تعلیم اور روایتی تعلیم دونوں طریقہ کار میں موجود ہے۔ میڈیکل کالج اور یونیورسٹی یہاں کے لوگوں کا دیرینہ مطالبہ ہے۔ مگر یہ مطالبہ سیاسی جماعتوں کے نمائندگان پوری کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

خواتین میں خواندگی کی شرح تقریباً 32 فیصد ہے اور ان میں سے وہ خواتین جو بی-اے کر لیتی ہیں ان کے لیے یونیورسٹی کے نہ ہونے سے اپنی تعلیم کو آگے جاری رکھنا شدید مشکل ہو جاتا ہے۔ روایتی علاقہ ہونے کی وجہ سے انہیں اپنا گھر اور علاقہ بھی چھوڑنے کی اجازت نہیں ملتی جس کی وجہ سے ان کے لیے معاشی و معاشرتی طور پر آگے بڑھنے کے مواقع بہت شدت سے ختم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے کالجز تو موجود ہیں، مگر شہری ان میں تعلیمی معیار کے حوالے سے زیادہ مطمئن دکھائی نہیں دیتے۔ کل کالجز کی تعداد 35 ہے جس میں سے 18 لڑکوں اور 17 کالجز لڑکیوں کے لیے ہیں۔ 7 ڈگری کالج ہیں جبکہ صرف 6 پوسٹ گریجویٹ کالجز ہیں۔

حل

تعلیمی اداروں کے انفرسٹرکچر کو ٹھیک کیا جائے۔ اور ان میں جدت اور اضافہ لایا جائے۔ سرکاری سطح پر سکولوں اور کالجوں میں اساتذہ کی کمی ہے، اس کو فوراپورا کیا جائے۔ تعلیمی اداروں میں مسلسل سیاسی مداخلت رہتی ہے، اس کو ختم کیا جائے اور اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ سیاست کی پر تشدد لہریں تعلیمی اداروں میں داخل نہ ہونے پائیں۔

ضلع میں میڈیکل کالج اور یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے اور فنی تعلیم کے لیے ٹیکنکل کالجز کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ عام تعلیم کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کے لیے فنی تعلیم کے دروازے ان کے لیے معاشی ممکنات میں اضافہ کر سکیں۔ یہاں کالجز کی تعداد میں کم از کم 7 کالجز کی اور گنجائش ہے، اس کو پورا کیا جانا چاہیے اور ان تمام کاموں کے لیے مقامی عمائدین، سول سوسائٹی اور میڈیا کے ارکان کو متحرک کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔

اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ خواتین کے لیے ماسٹرز لیول تک کی تعلیم کو پُرسہولت بنانے کے لیے یا تو یہاں کسی دوسری بڑی یونیورسٹی کا سب-کیمپس برائے خواتین کھولا جائے، یا پھر یہاں اک یونیورسٹی قائم کر کے خواتین کے لیے آگے پڑھنے اور بڑھنے کے ذرائع تخلیق کیے جائیں۔ اس سلسلہ میں مقامی سول سوسائٹی اور غیر سرکاری تنظیموں کو مقامی اکابرین کے ساتھ مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے اور ضلعی حکومت اور صوبائی حکومت پر دباؤ بڑھایا جانا چاہیے۔

بے روزگاری کا مسئلہ

اس شہر کا ایک بنیادی مسئلہ بے روزگاری کا ہے۔ سرحدی علاقہ ہونے کی وجہ سے بڑی انڈسٹریز اور بڑے پراجیکٹ کا فقدان ہے، جس کی وجہ سے یہاں ملازمتوں کے مواقع کم ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مرکز سے یہ شہر دور ہونے کی وجہ سے یہاں کی مقامی آبادی کو دور دراز جا کر روزی روٹی کے مواقع پیدا کرنا پڑتے ہیں، جس کی وجہ سے متنوع مسائل کا اُن کو سامنا بھی رہتا ہے۔ بے روزگاری کی وجہ سے ہی نوجوانوں میں منشیات کے استعمال کا رجحان بڑھ رہا ہے اور ساتھ ساتھ میں یہی اک وجہ یہاں پر نوجوانوں میں مذہبی انتہا پسندی کے بڑھنے کی بھی بتائی جاتی ہے۔

حل

اس شہر کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ میگا پراجیکٹس اور صنعتیں لگائی جائے۔ فنی تعلیم کے اداروں کے فوری قیام کے بعد، مقامی اور علاقائی صنعتی ضروریات کے مطابق تربیت یافتہ نوجوان پیدا کیے جائیں۔ نوجوانوں کو پیشہ وارانہ تربیت کی طرف لایا جائے اور ان کے تعلیمی اور پیشہ وارانہ معیار کو بہتر سے بہتر کیا جائے تاکہ ان کی بیروزگاری کا مسئلہ حل ہو سکے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ منشیات اور مذہبی انتہاپسندی جیسے معاملات کے چنگل میں بھی نہ آئیں۔

غیر سرکاری تنظیمیں اس سلسلہ میں اک اہم اور قائدانہ کردار ادا کر سکتی ہیں۔ انہیں مقامی اور بین الاقوامی امدادی اداروں کے تعاون سے یہاں کے نوجوانوں اور بالخصوص خواتین کو پیشہ وارانہ مہارتوں میں تربیت فراہم کرنے کے پراجیکٹس پر کام کرنا چاہیے۔ چونکہ نئے قوانین کے تحت پچھلے کچھ عرصے میں غیر سرکاری تنظیموں کو جنوبی پنجاب کے اضلاع میں کام کرنے میں دقت پیش آ رہی ہے تو اس سلسلہ میں مقامی میڈیا اور سیاسی اکابرین کو ان کا ساتھ دینا چاہیے۔

جاگیرداری نظام کا چیلنج

یہ ضلع دیہی پس منظر رکھتا ہے، اس طرح یہاں جاگیردارانہ ذہنیت کی اجارہ داری محسوس کی جاتی ہے۔ مخصوص ذات برادری کے لوگ وسائل پر قابض ہیں۔ زمین داری میں چند زمین داروں کا قبضہ ہے۔

حل

مخصوص برادریوں کو انتخابات میں اجارہ داری قائم کرنے کا تدارک کیا جائے۔ مقامی حکومتی نظام کو مضبوط کیا جائے اور لوگوں میں سیاسی شعور کو بڑھانے کے لیے ضلع میں تعلیمی ماحول پیدا کیا جائے۔ حکومت یہاں صنعتوں کے قیام میں دلچسپی دکھائے تاکہ لوگ روزگار کے حوالے سے خودمختار ہوں اور پھر باشعور سیاسی فیصلے بھی کر سکیں۔

خواتین کے مسائل

اس ضلع کی خواتین کو کئی طرح کے مسائل کا سامنا ہے۔ انھیں تعلیم کے میدان اور صحت کے میدان اور روزگار کے میدان میں مشکلات رہتی ہیں۔ اگر کوئی خاتون پڑھ لکھ بھی جائے تو اس کے لیے روزگار کے علاوہ مقامی سطح پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا کوئی انتظام موجود نہیں۔ اک عمومی کیفیت ہے بددلی کی جس کی وجہ سے خواتین تعلیم کی جانب زیادہ مائل نہیں ہو پاتیں۔ طبی لحاظ سے سرکاری سطح کے ہسپتالوں میں زچہ وبچہ کے معاملات کے لیے گنجائش آبادی سے بہت ہی کم ہے جس کی وجہ سے اکثر اوقات خواتین کو دوسرے اضلاع جانا پڑتا ہے۔ یہ درست نہیں۔ نیز یہاں کم عمری کی شادیوں کا بہت رواج ہے اور اکثر اوقات تو 12 برس تک کی بچیوں کی شادی کروادی جاتی ہے۔

حل

خواتین کی تعلیم، بالخصوص اعلیٰ تعلیم، صحت اور روزگار کے لیے مواقع پیدا کیے جائیں۔ خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے لیے آگاہی مہم چلائی جائے۔ خواتین کو زچگی کے مسائل کا سامنا رہتا ہے، یہ ضروری ہے کہ ہر یونین کونسل سطح پر ان کے لیے عمدہ طبی مراکز قائم کیے جائیں اور موجود ہسپتالوں کی گنجائش میں اضافہ بھی کیا جائے۔ کم عمری کی شادی کے خلاف قانون تو موجود ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر ضلعی انتظامیہ سختی سے پابندی کروائے۔

راجن پور

تعارف

راجن پور کی بنیاد مخدوم راجن شاہ نے 1731۔ 1733ء میں رکھی۔ ابتدا میں راجن پور کا تحصیل ہیڈ کواٹر کوٹ مٹھن تھا جبکہ اس کا ضلعی ہیڈ کواٹر ڈیرہ غازی خان تھا۔

راجن پور میں زیادہ تر بلوچ قبائل آباد ہیں جن میں آباد دریشک، مسوری، جتوئی مزاری، گورچانی، لنڈ، لغاری، پتافی، کھچیلا، احمدانی، گورمانی بزدار، مزاری، جسکانی، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں کے لوگ بلوچی اور سرائیکی زبان بولتے ہیں۔ راجن پور کا بڑا علاقہ غیر آباد اور ویران ہے اسے "پچادھ" کہا جاتا ہے۔ اس علاقہ میں پانی کی شدید کمی ہے اور رقبے ویران پڑے ہوئے ہیں پانی کی عدم فراوانی کے سبب آبادی کم ہے۔ یہاں پانی کا واحد ذریعہ بارش ہے۔ بارشی پانی کو نشیب میں نشیب میں جمع کر کیا جاتا ہے جسے "ٹوبہ" کہتے ہیں۔ ضلع راجن پور کا مشرقی حصہ سیلاب سے ڈوبتا ہے جبکہ مغربی حصہ خشک سالی اور قحط کا شکار رہتا ہے۔

ضلع راجن پور 1998ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 1,103,618 نفوس پر مشتمل تھی۔ جبکہ 2017 کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 1,995,958 ریکارڈ کی گئی۔ اس شہر کی آبادی تیزی سے بڑھی ہے۔ جس سے کئی طرح کے مسائل نے جنم لیا۔ یہ مسائل حل ہو سکتے ہیں اگر محکمہ بہبود آبادی کی کارکردگی کو بہتر بنایا جائے اور مقامی سطح پر بڑھتی آبادی کے نقصانات سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔

راجن پور میں قومی اسمبلی کے 3 حلقے ہیں: این اے 193 تا 195، جب کہ صوبائی اسمبلی کے 5 حلقے ہیں: 293 تا 297۔

راجن پور کے سیاسی خاندان

مزاری خاندان

میر بلخ شیر مزاری 1970 میں ایم پی اے تھے اور ان کے بھائی ساحر باز مزاری 1970 میں ایم این اے تھے۔ بلخ شیر مزاری نگران وزیر اعظم بھی رہے۔ عاشق محمد خان مزاری (بلخ شیر مزاری کے رشتہ دار، 1977 میں ایم این اے تھے اور ان کی اہلیہ دورا شہوار 1977 میں داماد عاشق کے خصوصی پر ایم این اے تھیں۔ شوکت مزاری 2002 میں تین بار ایم پی اے منتخب ہوئے تھے۔ شوکت مزاری کے بھتیجے عاطف خان مزاری 2013 میں ان کی نشست پر ایم پی اے بنے تھے۔ بلخ شیر کے پوتے دوست محمد خان مزاری ایم پی اے اور ڈپٹی اسپیکر پی اے۔ بلوچ صاحب کے بیٹے ریاض محمود مزاری ایم این اے ہیں۔ عاشق مزاری کی صاحبزادی ڈاکٹر شیرین مزاری خصوصی نشست پر ایم این اے اور موجودہ وفاقی وزیر ہیں۔

دریشک خاندان

نصر اللہ دریشک 1970 میں ایم پی اے تھے۔ ان کے بیٹے حسنین دریشک بیٹھے ایم پی اے اور صوبائی وزیر رہے۔ نصر اللہ کے بھتیجے اویس خان ایم پی اے ہیں۔ نصر اللہ کے بھائی پوتے احمد علی خان ڈی جی خان سے ایم پی اے ہیں۔ فاروق امان اللہ ایم پی اے اور ان کے والد امان اللہ خان تین بار ایم پی اے منتخب ہوئے، امان اللہ کے والد رمضان خان دریشک مرحوم 1980 کے ایم پی اے تھے۔ رمضان کے بھائی کرم الٰہی خان 1985 میں ایم پی اے تھے، کرم الٰہی کے بیٹے ڈاکٹر حفیظ الرحمان 2013 میں ایم این اے تھے۔ طارق خان دریشک نے تین بار الیکشن لڑا لیکن کبھی جیت نہ سکے اور 2018 میں پہلی بار ایم پی اے کی سیٹ جیتی اور بعد میں 15 دن بعد انتقال کر گئے اس کے بعد ان کے بھائی اویس کی جگہ پر الیکشن لڑا۔

گورچانی خاندان

اطہر گورچانی 2008 میں ایم پی اے تھے (ان کے والد سابق ڈی آئی جی آئی ایس آئی تھے) اور ان کے کزن شیر علی خان ایم پی اے اور 2013 میں ڈپٹی اسپیکر تھے۔ شیر علی کے والد پرویز خان گورچانی الیکشن 2018 میں میدان میں اُترے مگر ہار گئے۔

صحت کے مسائل

یہاں صحت کی جدید سہولیات کا شدید فقدان ہے۔ پورے ضلع میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق صرف 5 بڑے ہسپتال ہیں، جبکہ ڈسپنسریز کی تعداد صرف 30 ہے۔ صحت کے دیہی مراکز صرف 7 ہیں اور بنیادی صحت کے مراکز کی تعداد 32 ہے۔ ضلع کی آبادی اور رقبے کے لحاظ سے سہولتوں کا یہ معیار اور تعداد کسی طور بھی مناسب نہیں۔ پورے ضلع بھر میں ایک بھی برن سنٹر نہیں جس میں جلنے والے افراد کا کوئی علاج ممکن ہو سکے۔ اس کے علاوہ موجود سرکاری ہسپتالوں میں مشینیں یا تو بہت کم ہیں یا پھر خراب رہتی ہیں جس کی وجہ سے ضروری تشخیص کے مراحل ممکن ہی نہیں ہو پاتے۔ مریضوں کو یا تو نہایت مہنگے داموں یہ ٹیسٹس نجی لیبارٹریوں سے کروانے پڑتے ہیں یا پھر یہ ٹیسٹ ہو ہی نہیں پاتے۔

اسی طرح، پورے ضلع میں ایک بھی ٹراما سینٹر موجود نہیں، بالخصوص خواتین کے لیے۔ صحت کی سہولیات نجی شعبہ میں موجود تو ہیں مگر وہ بھی اکثر بنیادی نوعیت کی ہیں۔ مریضوں کو اکثر ملتان، ڈی جی خان، اور بعض اوقات تو لاہور کے لیے ریفر کر دیا جاتا ہے۔

حل

صحت کی موجودہ سہولیات نہایت ہی ناکافی ہیں۔ ان میں صرف عام اضافے کی ہی ں ہیں، بلکہ انہیں کم از کم دوگنا کرنے کی ضرورت ہے۔ بڑے ہسپتالوں کی وسائل اور ذرائع میں فوری طور پر اضافہ کرنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ مریضوں کی خدمت کر سکیں۔ اس کے علاوہ، ہر یونین سطح کی حد تک کم از کم ایک سرکاری ڈسپنسری کا ہونا لازم ہے اور ہر دو یونین کونسلز میں کم از

کم ایک زچہ و بچہ کا مرکز ہونا چاہیے جہاں خواتین سہولت لے ساتھ طبی سہولیات سے فائدہ حاصل کر سکیں۔ اس سے بھی زیادہ بہتر ہو گا کہ خواتین کے لیے مخصوص ہسپتال ضلعی اور تمام تحصیل ہیڈ کوارٹرز میں قائم کیے جائیں۔

بہت بد قسمتی ہے ضلع میں خواتین کے خلاف تشدد کی شکایات ملتی ہیں اور بسا اوقات ان پر تشدد بہت خوفناک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اول تو اس تشدد کی نفسیات کو روکنے کی اشد ضرورت ہے اور دوسرا یہ کہ تشدد کی بدقسمت شکار خواتین کے علاج کے لیے برن سینٹر کا قیام ضروری ہے۔ صرف زچگی کے معاملات میں ہی نہیں، بہت ساری خواتین جو اس بھیانک تشدد کا شکار ہو جاتی ہیں، علاج کے لیے لے جاتے ہوئے رستے میں ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ مقامی طور پر اک برن سینٹر اس مسئلہ کو عمدہ طریقے سے حل کر سکے گا۔

تمام سرکاری ہسپتالوں میں جدید مشینری اور جدید آلات کی دستیابی کو یقینی بنایا جانا چاہیے اور وہ مشینیں جو موجود ہیں، مگر کام کرنے کی صورتحال میں نہیں ہیں، انہیں بھی فوری طور پر ٹھیک کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں مقامی آبادی کو محکمہ صحت کے اہلکاروں پر مثبت سماجی دباؤ قائم رکھنے کی ضرورت ہے اور صحت کی سہولیات میں بہتری اور اضافے کے لیے ضلعی حکومتی اہلکاروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ غیر سرکاری تنظیموں کو اس معاملہ میں اپنا کردار گرمجوشی سے ادا کرنا چاہیے۔

نیز، راجن پور شہر میں ٹراما سینٹر قائم ہونا چاہیے اور اس کی شاخیں ضلع کے تمام تحصیل ہیڈ کوارٹرز میں قائم ہونی چاہئیں۔ اس سلسلہ میں کم از کم ایک ٹراما سینٹر صرف خواتین کے لیے مخصوص ہونا چاہیے اور مزید یہ کہ خواتین کے لیے مخصوص ہسپتال بھی قائم ہونے چاہئیں۔ فی الحال خواتین کے لیے کوئی بھی ہسپتال مخصوص نہیں، گو کہ زنانہ وارڈ وغیرہ تمام ہسپتالوں میں موجود ہیں، مگر وہ بڑھتی ہوئی آبادی کے دباؤ کے سامنے بے بس ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

تعلیم کے مسائل

یہ شہر روایتی نوعیت کی قبائلی اور جاگیردارنہ سوچ کے زیر اثر رہا ہے اور اب بھی معاملات و حالات کچھ زیادہ بدلے نہیں۔ ضلع بھر میں تعمیر و ترقی کے مظاہر دیگر شہروں کی نسبت بہت ہی کم ہیں۔ یہاں سماجی پسماندگی بے انتہا ہے اور اس کی بنیادی وجہ تعلیمی میدان میں پیچھے رہ جانا ہے۔ پورے ضلع میں صرف 17 کالجز ہیں جس میں سے 9 لڑکوں اور 8 لڑکیوں کے لیے ہیں۔ کالجز میں اساتذہ کی تعداد عموماً کم رہتی ہے۔ یہاں ٹرانسفر ہو کر آنے والے، واپس اپنا تبادلہ پنجاب کے اپنے شہروں میں ہی کروا لیتے ہیں۔ جو بہت بدقسمتی کی بات ہے۔

نجی شعبہ میں بھی کالجز موجود ہیں، مگر وہاں کے اخراجات مقامی آبادی کی اکثریت کی پہنچ سے باہر ہیں۔ تعلیمی معیار کے حوالے سے سرکاری اور نجی کالجز میں کچھ فرق محسوس نہیں ہوتا۔ یہاں یونیورسٹی موجود نہیں جس کی وجہ سے کوالیفائی کرنے والے بچوں کو ضلع سے باہر جانا پڑتا ہے۔ لڑکوں کے لیے تو یہ نسبتاً آسان اور ممکن ہوتا ہے، مگر لڑکیوں کی اکثریت ایف اے، بی اے تک ہی تعلیم حاصل کر پاتی ہے۔ ان کے لیے مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے گھر اور ضلع سے باہر جانا مشکل تر اس لیے ہے کہ مقامی روایات عموماً رستے کی بلند رکاوٹ بن جاتی ہیں۔

فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم کا پورے ضلع میں ایک بھی ادارہ سرکاری سطح پر موجود نہیں جس کی وجہ سے نوجوانوں اور خواتین کو کسی قسم کی کوئی پیشہ وارانہ تربیت فراہم نہیں کی جا رہی۔ پڑھنے لکھے نوجوانوں کی اک کثیر تعداد بیروزگاری کا شکار ہے اور خواتین میں بیروزگاری تقریباً 90 فیصد سے زیادہ ہو گی۔ نوجوانوں اور خواتین میں بیروزگاری ختم کرنے کی کوئی سکیم موجود نہیں اور کوئی سرکاری ادارہ اس بات کی طرف متوجہ نہیں کہ انہیں اپنے چھوٹے چھوٹے کاروبار کرنے کے لیے قرضے دیے جانے چاہئیں، بالخصوص ان خواتین کو جو اپنی تعلیم مکمل کر چکی ہیں۔

حل

راجن پور ضلع میں یونیورسٹی کا قیام فوری طور پر ناگزیر ہے۔ ضلع کی آبادی کا حق ہے کہ کم از کم راجن پور شہر میں ضلع کی اپنی یونیورسٹی موجود ہو اور اس کے سب-کیمپسز ضلع کی باقی تحصیلوں میں قائم کیے جائیں۔ یہ بہت ضروری ہے، بالخصوص خواتین کے لیے تاکہ وہ کم سے کم فاصلہ طے کر کے، اک روایتی علاقے میں اپنی تعلیمی ضروریات کو پورا کر سکیں۔

ضلع بھر میں کالجز کی تعداد کو دوگنا کرنے کی ضرورت ہے اور عوامی حلقوں کو اس سلسلہ میں محکمہ تعلیم، ضلعی حکومت اور صوبائی محکمہ تعلیم کے سامنے اپنے یہ مطالبات رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں کوئی تحرک نظر تو نہیں آتا تو خیال ہے کہ سماجی اور غیر سرکاری تنظیموں کو آگے بڑھنا چاہیے اور قومی اور بین الاقوامی امدادی اداروں کے ساتھ مل کر اس معاملہ کو اٹھانا چاہیے۔

اساتذہ کی جو آسامیاں مختلف سکولوں اور کالجوں میں خالی ہیں، ان پر اساتذہ کو تعینات کیا جائے اور مقامی عمائدین کو محکمہ تعلیم کے ساتھ اس سلسلہ میں گفت و شنید کی اشد ضرورت ہے۔

خواتین کے تعلیمی اداروں کی تعداد کو بڑھایا جانا چاہیے اور ان میں تعلیمی شانداریت کے لیے مقامی طور پر خواتین کے لیے مخصوص فنی، تکنیکی، پیشہ وارنہ تعلیم کے ساتھ ساتھ، یونیورسٹی کا سب-کیمپس بھی قائم کیا جائے جو صرف خواتین طالبات کے لیے مخصوص ہو۔ حکومت کو چاہیے کہ یہ کام جلد از جلد کرے اور حکومت پر اس مطالبے کے لیے دباؤ بڑھانے کی ضرورت ہے جس کے لیے عوامی حلقوں کو ممبران صوبائی اسمبلی تک اپنے مطالبات مسلسل پہنچانے چاہئیں

ضلع بھر میں، کالجز کی تعداد کی طرح سیکنڈری اور ہایئر سیکنڈری تعلیمی اداروں کی تعداد دوگنا کی جائے اور ان میں سبجیکٹ سپیشلسٹ اساتذہ کی تقرریاں کی جائیں۔

فنی تعلیم کے اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ نوجوانوں کو فنی اور تکنیکی تعلیم سے آگاہی ہو اور وہ اپنے روزگار کے لیے مقامی، علاقائی طور پر یا بیرون ملک بندوبست کر سکیں۔

نوجوانوں اور خواتین کو چھوٹے کاروبار کرنے کی تربیت فراہم کی جائے اور انہیں سرکاری اداروں کے ساتھ متعارف کروایا جائے جو چھوٹے کاروباروں کے لیے قرضے فراہم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وفاقی حکومت "کامیاب نوجوان" کے نام سے چھوٹے کاروبار کے قرضوں کی سکیم چلا رہی ہے جس کے بارے میں مقامی طور پر کوئی معلومات موجود نہیں۔ غیر سرکاری تنظیموں کو اس سلسلہ میں

مقامی نوجوانوں اور خواتین کو معلومات فراہم کرنی چاہیئں کیونکہ صنعتوں کی غیر موجودگی اور سرکاری اداروں کی عدم توجہی کی وجوہات سے مقامی طور پر روزگار کے مسائل حل نہیں ہوسکتے۔ اک سماجی ایکشن مسلسل موجود رہنا چاہیے۔

پینے کے صاف پانی کا مسئلہ

یہاں پانی کے صاف پانی کا مسئلہ بہت بڑا ہے۔ ضلع بھر میں زیرِ زمین پانی پینے کے لائق نہیں، بہت کڑوا ہے، اس میں Unwanted Chemicals موجود ہیں جو دانتوں، ہڈیوں، گردوں اور آنتوں کے امراض پیدا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پانی اب سطح زمین سے بہت نیچے بھی جا چکا ہے۔ سرکاری اداروں کے تحت واٹر سپلائی سکیمز اک عرصہ سے تعطل کا شکار ہیں۔ پرانے پلانٹ کو ایک تو صحیح طریقے سے دیکھ بھال نہیں کیا جاتا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی مشینیں اور ضلع کے شہری اور قصباتی علاقوں میں بچھائے گئے پائپ لائنز بھی بوسیدگی کا شکار ہو چکے ہیں۔ پانی اکثر ضائع ہوتا نظر آتا ہے اور کہیں کہیں تو اس میں سیوریج بھی مکس ہو رہی ہوتی ہے۔

حل

ضلع بھر میں نئی واٹر سپلائی سکیمز کی اشد ضرورت ہے اور کم از کم ہر یونین کونسل کی سطح پر ایک واٹر فلٹریشن پلانٹ موجود ہونا چاہیے جہاں سے عوام کو پینے کا صاف پانی مہیا ہو سکے۔ مقامی حکومتوں کو پینے کے صاف پانی کی عوامی فراہمی کے لیے جگہ جگہ نلکے لگانے چاہیئں جو کوئی بہت بڑا خرچہ نہیں مانگتا، مگر متعلقہ حکومتی ادارے اس طرف سے تقریباً کُلی طور پر غیر متوجہ ہیں۔ پینے کے صاف پانی کی فراہمی کی موجودہ سہولیات کے انفراسٹرکچر کو بہتر بنایا جانا چاہیے جس میں بڑے پلانٹس میں فلٹریشن کا نظام، پانی کے ذخیرے کی جگہ کی باقاعدگی سے صفائی ستھرائی کا انتظام اور شہری و قصباتی مراکز میں ڈالے گئے پانی کے پرانے پائپس کی تبدیلی شامل ہے۔

راجن پور کے ضلعی ہیڈ کوارٹر میں بھی پینے کے صاف پانی کے مسائل شدت اختیار کرتے جا رہے ہیں، مگر تحصیلوں اور دیگر چھوٹے قصبات میں پینے کے صاف پانے کے معاملات مزید سنگین ہو چکے ہیں۔ ان کا حل یہ ہے کہ مقامی حکومتوں پر سماجی طور پر رہنماؤں اور عمائدین کا دباؤ بڑھایا جانا چاہیے تاکہ سرکاری ادارے عوامی فلاح کی جانب بھرپور توجہ دے سکیں۔

سیلاب کی تباہ کاریوں کی روک تھام

راجن پور ضلع اور شہر دریائی رقبہ رکھتا ہے، اور اس لیے سیلاب کی زد میں بھی رہتا ہے۔ سیلاب لوگوں کے گھروں اور اُن کے پالتو مویشیوں کا نقصان کرنے کے ساتھ ساتھ فصلوں اور دیگر املاک کو نقصان پہنچانے کا سبب بنتا ہے۔ ضلع راجن پور کا بیشتر حصہ ہر سال سیلاب سے متاثر ہوتا ہے یہ سیلاب دریائے سندھ اور رودھ کوہی (پہاڑوں کی جانب سے آنے والا اچانک سیلابی پانی) میں آتے ہیں اور بسا اوقات یہ سیلاب شہری علاقوں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔

حل

شہریوں کا مطالبہ ہے کہ ضلع بھر میں پنجاب سمال ڈیمز کے محکمہ کی رپورٹ اور سفارشات کے مطابق جہاں جہاں بند باندھنے کی تجاویز دی جاچکی ہیں، وہاں پختہ اور پائیدار سیلابی بند باندھے جائیں۔ اس سلسلہ میں مقامی شہری رہنما اور غیر سرکاری تنظیموں کو آگے بڑھنے کی ضرورت ہے اور مقامی طور پر منتخب ممبران صوبائی اسمبلی کے ساتھ مل کر پنجاب حکومت کے متعلقہ محکموں تک رسائی حاصل کر کے سمال ڈیمز کے محکمہ کی سفارشات پر عمل کروایا جانا چاہیے۔ یہ ڈیم ایسے بنائے جانے چاہئیں، جیسا کے سفارشات کی جاچکی ہیں، کہ یہ سیلابی پانی کی تباہ کاریوں کا سدباب تو کرے، مگر صدیوں پرانے مقامی ماحولیات کے نظام کو متاثر نہ کرے۔ اس کے علاوہ جہاں جہاں پانی کا ذخیرہ کرنے کے ڈیمز بنانے کا کہا گیا ہے، وہاں وہاں چھوٹے ڈیمز بھی تعمیر کیے جائیں۔

حکومتی اداروں کے پاس آفت زدہ علاقوں کے مکینوں کو آفت سے نمٹنے کی تربیت دی جانے کے ذرائع اور وسائل ہر سال پنجاب حکومت سے آتے ہیں جو ضلعی حکومتی اہلکاروں کی صوابدید پر ہوتے ہیں۔ ان ذرائع اور فنڈز کو استعمال کیا جانا چاہیے اور مقامی آبادی کو کسی بھی ناگہانی صورتحال سے نبٹنے کی تربیت فراہم کی جانی چاہیے۔ یہ تربیت بالخصوص ان علاقوں میں فراہم کی جانی چاہیے جو دریائے سندھ اور رودھ کوہی کے سیلابی رستے میں موجود ہیں۔ خیال ہے کہ تربیت اور پھر سیلابی بند باندھنے کے بعد سیلاب کے پانی سے ہونے والے نقصان کو بہت حد تک کم کیا جا سکے گا۔

شاہرات کی بری حالت

ضلع بھر کی سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہتی ہیں اور خود راجن پور شہر کی سڑکوں کا برا حال ہے۔ مسئلہ اک یہ بھی ہے کہ سڑکوں کی بحالی کے ٹھیکے مسلسل ہوتے رہتے ہیں مگر سڑکوں کی حالت بہت عمدہ نہیں ہو پاتی۔ ضلعی ہیڈ کوارٹر اور تحصیل ہیڈ کوارٹرز کے علاوہ قصباتی علاقوں میں بھی سڑکوں اور گلیوں کی حالت بدتر ہوتی جارہی ہے۔

زرعی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں کھیت سے منڈیوں تک کی سڑکوں کی بہت اہمیت ہے، مگر وہ سڑکیں بھی شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی ہیں اور ان پر قائم چھوٹے چھوٹے پل بھی بہت ساری جگہوں پر ٹوٹ چکے ہیں جس کی وجہ سے علاقہ کے اندر کا رابطہ بہت مشکل تر ہوتا چلا جارہا ہے۔

حل

فوری ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ڈیرہ غازی خان سے کشمور تک کی سڑک کو دورویہ کیا جائے کیونکہ راجن پور بھی اسی سڑک پر واقع ہے۔ سڑک کے دورویہ ہو جانے سے راجن پور آمدورفت کے حوالے سے بہت بہتر ہو جائے گا اور اس سے یقیناً زرعی اجناس کے کام میں تیزی کی بھی امید ہو گی۔ یہ شاہراہ چونکہ وفاقی حکومت کے ادارے کے دائرہ اختیار میں ہے تو اس سلسلہ میں ممبران قومی اسمبلی تک یہ مطالبہ پہنچانے کی ضرورت ہے کہ اس سڑک کو دورویہ کیا جائے۔ غیر سرکاری تنظیموں کو مقامی کاروباری حلقوں کے ساتھ مل کر قومی اسمبلی کے ممبران تک یہ مطالبہ پہنچانا چاہیے۔

اس کے علاوہ راجن پور شہر، اس کے تحصیلوں اور قصباتی علاقوں کے ساتھ ساتھ تمام دیہاتی علاقوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانے والے تمام سڑکوں کی مرمت کی جانی چاہیے اور انہیں نہ صرف قابل استعمال بنایا جائے بلکہ ان کے معیار کی طرف بھی خصوصی توجہ دی جائے۔ بالخصوص وہ سڑکیں جو کھیت تا منڈی جاتی ہیں، ان کی فوری بحالی کی جائے کیونکہ اس سے مقامی زرعی معیشت کو خصوصی فائدہ ہو گا اور چھوٹے کاشتکار اس سے بہت سہولت پائیں گے۔

سڑکوں کی بحالی کے معاملات کے لیے مقامی شہریوں، رہنماؤں اور عمائدین کو مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے مقامی میڈیا اور غیر سرکاری تنظیموں رابطہ اور سہولت کاری کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔

مظفر گڑھ

مختصر تعارف

مظفر گڑھ کی بنیاد نواب مظفر خان نے 1794ء میں رکھی۔ مظفر گڑھ میں مقامی زبان سرائیکی ہے۔ یہاں زرعی پیداوار میں آم، کپاس، گندم، چنا، چاول، اور کماد شامل ہیں۔ اس شہر میں دو دریا بہتے ہیں۔ یہاں کے وسیع رقبے پر آم کے باغات ہیں، یہ شہر ملتان سے متصل ہے۔ ملکی سیاست میں اس شہر کو خاص پہچان رہی ہے۔ نواب زادہ نصر اللہ خان کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ اس کے علاوہ مصطفی کھر اور حنا ربانی کھر کا بھی یہ آبائی ضلع ہے۔

یہ گرم اور خشک شہر ہے۔ اس میں فضائی آلودگی کے مسائل بھی ہیں۔ اس شہر میں 3 شوگر ملز اور درجنوں ٹیکسٹائل اور کاٹن انڈسٹریاں ہیں۔ اس کے علاوہ تھرمل پاور بھی اسی شہر میں ہے۔ یہ شہر کچے اور تھل کے علاقے پر مشتمل ہے۔

ضلع مظفر گڑھ کی 1998ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی 2,635,903 نفوس پر مشتمل تھی۔ جبکہ 2017 کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 4,322,009 ریکارڈ کی گئی۔ اس شہر کی آبادی تیزی سے بڑھی ہے۔ جس سے کئی طرح کے مسائل نے جنم لیا۔ یہ مسائل ختم ہو سکتے ہیں اگر محکمہ فیملی پلاننگ کی کارکردگی کو بہتر بنایا جائے۔ مقامی سطح پر بڑھتی آبادی کے نقصانات سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔

چھوٹی عمر کی شادیوں پر مکمل پابندی لگائی جائے۔ وسائل کے مطابق بچوں کی تعداد کی آگاہی کو عام کیا جائے۔ مذہبی طبقہ کو آن بورڈ لیا جائے۔ دیہی ثقافت میں بالخصوص کچے کے علاقے میں مذہبی، سماجی اور سیاسی رہنماؤں کی معاونت لی جائے۔ یہ شخصیات لوگوں کے اندر بڑھتی آبادی کے نقصانات سے روشناس کروائیں۔

مظفر گڑھ میں قومی اسمبلی کے 6 حلقے ہیں: این اے 181 تا 186، جب کہ مظفر گڑھ میں صوبائی اسمبلی کے 12 حلقے ہیں: پی پی 268 تا 279۔

مظفر گڑھ کے سیاسی خاندان

کھر خاندان

مصطفی کھر خاندانی سیاست میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ جب مشتاق گورمانی گورنر بنے تو اس علاقے میں گورمانی قبیلہ مضبوط ہو گیا۔ اس کے جواب میں کھر خاندان نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کیا اور مصطفی کھر کے والد نے مصطفی کھر کو الیکشن کے لیے کھڑا کیا۔ اس وقت مصطفی کھر کی عمر چوبیس سال تھی۔ ایوب کے دور میں جب بھٹو نے وزارت خارجہ سے استعفیٰ دیا اور ٹرین کے ذریعے سندھ گئے

تو مصطفیٰ کھر کوٹ ادو میں بھٹو سے ملنے آئے۔ اس کے بعد وہ بھٹو کے قریب ہو گئے۔ وہ پنجاب کے گورنر اور پھر پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے۔

انہوں نے 1990 میں پی پی پی چھوڑ دی اور غلام مصطفیٰ جتوئی کی کابینہ میں شامل ہوئے۔ غلام مصطفیٰ کھر نے انتخابات سے پہلے مسلم لیگ (ف) سے ہاتھ ملایا اور انتخابات کے بعد پی ٹی آئی میں شمولیت اختیار کی۔

غلام محمد نور ربانی کھر مصطفیٰ کھر کے بھائی ہیں۔ یہ حنا ربانی کھر کے والد ہیں۔ حنا ربانی کھر پاکستان کی وزیر خارجہ رہ چکی ہیں۔ مصطفیٰ کھر اور غلام محمد نور ربانی کھر نے 1993 میں ایک دوسرے کے خلاف الیکشن لڑا۔

دستی خاندان

عبدالحمید دستی پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ان کے والد سول سروس میں تھے۔ انہوں نے 1945 میں مظفر گڑھ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ وہ مختلف سرکاری محکموں جیسے تعلیم، صحت، قانون زراعت میں اہم عہدوں پر رہے۔ یہ خاندان تقسیم سے پہلے سیاست میں تھا۔ عبدالحمید دستی کے بیٹے امجد حمید دستی نے بہت سی سیاسی جماعتیں تبدیل کیں۔ امجد حمید 1985 کے انتخابات میں وزیر خوراک مقرر ہوئے۔ بعد میں انہیں پنجاب کا وزیر خزانہ بنا دیا گیا۔ ان کا خاندان 2018 کے انتخابات میں پی ٹی آئی کے ساتھ تھا۔

گورمانی خاندان

میاں محبوب گرومانی کو 1884 میں سر کا خطاب ملا۔ شیخ احمد نو آبادیاتی دور میں برطانوی حکومت کے ساتھ تھے۔ ان کے دادا میاں مشتاق گورمانی قیام پاکستان سے قبل ریاست بہاولپور کے وزیر اعظم تھے۔ مشتاق گرومانی یونینسٹ پارٹی میں تھے۔ وہ مغربی پاکستان کے گورنر رہے اور ون یونٹ سسٹم بنانے میں ان کا بڑا حصہ تھا۔

نوابزادہ نصر اللہ خاندان

نوابزادہ نصر اللہ کے والد نواب سیف اللہ تھے۔ نواب سیف اللہ کے والد کا نام اللہ دتا تھا۔ اللہ دتا نے سکھوں کی بغاوت کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔

نوابزادہ نصر اللہ کا خاندان یونینسٹ پارٹی میں تھا۔ نوابزادہ نصر اللہ نے اپنے خاندان سے بغاوت کی اور یونینسٹ پارٹی میں شامل ہونے کے بجائے احرار پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ قیام پاکستان کے بعد وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ 1965 کے انتخابات میں نواب نصر اللہ خان نے فاطمہ جناح کی حمایت کی۔ نوابزادہ نصر اللہ کا بیٹا منصور خان 1993 میں وزیر بنا۔ نصر اللہ خان کشمیر کمیٹی کے چیئرمین بن گئے۔

قریشی خاندان

محسن قریشی سابق ایم این اے تھے جو بھٹو خاندان کے قریبی دوست کے طور پر جانے جاتے تھے۔ شبیر محسن قریشی ولد محسن قریشی بھی ایم این اے اور وزیر رہے جنہوں نے آزاد حیثیت سے کھر کو شکست دی اور پھر پی ٹی آئی میں شمولیت اختیار کی۔ ان کی اہلیہ خالدہ محسن قریشی 2002 میں ایم این اے منتخب ہوئیں۔ عباس قریشی سابق ایم این اے اور ان کے بیٹے امجد قریشی سینیٹر تھے۔ ارشد عباس قریشی ولد عباس قریشی نے ایم این اے کی نشست پر الیکشن لڑا۔

ہنجرا خاندان

سلطان محمود ہنجرا کو غازی کھر سیاست میں لائے۔ ملک اجمل ہنجرا ان کے بھائی بھی سیاست میں رہے۔ ملک احمد یار ہنجرا سابق صوبائی وزیر تھے۔ احمد یار ہنجرا کے بھائی قاسم ہنجرا ایم این اے رہے ہیں۔

گوپانگ خاندان

عاشق حسین گھوپانگ خاندان کے پہلے شخص تھے جو سیاست میں آئے۔ ان کے بھائی خضر حیات گھوپانگ سابق ناظم ہیں۔ جھو گو خان گھوپانگ ولد خضر حیات نے ایم پی اے کی نشست کے لیے الیکشن لڑا۔ امیر طلحہ ولد عاشق حسین گھوپانگ ایم این اے رہے ہیں۔ عمر خان گھوپانگ عاشق حسین گھوپانگ کے بھتیجے اور خضر حیات کے داماد ہیں۔

جتوئی خاندان

جتوئی خاندان تقسیم سے پہلے سیاست میں آیا۔ سردار کورا خان جتوئی خاندان کے سربراہ تھے اور انہوں نے برطانوی حکومت کے ساتھ کام کیا۔

عبدالقیوم جتوئی سابق وفاقی وزیر اور سردار نذر محمد خان کے صاحبزادے ہیں۔ ان کے بھائی سردار نصراللہ جتوئی سابق ایم پی اے اور وزیر اعلیٰ پنجاب کے مشیر تھے۔ قیوم جتوئی کے بہنوئی سردار معظم جتوئی سابق وفاقی وزیر تھے اور ان کے بیٹے داود جتوئی نے 2018 میں پی پی پی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا۔ ضیاء اللہ جتوئی، قیوم جتوئی کے ایک اور بہنوئی ہیں اور معظم جتوئی کے بھائی ہیں جنہوں نے 2018 میں الیکشن لڑا۔ ڈاکٹر ذکاء اللہ خان جتوئی معظم جتوئی کے چھوٹے بھائی ہیں اور 2018 کے ضمنی انتخابات میں ہار گئے ہیں۔ سردار خان محمد جتوئی الیکشن میں عبدالقیوم جتوئی کے خلاف جیت گئے تھے 2013 اور 2018 میں ہار گئے۔

صحت کے مسائل

ضلع مظفر گڑھ اور ملتان باہم جڑے ہوئے شہر ہیں۔ اس شہر کے باسی سنجیدہ علاج کے لیے ملتان کے نجی اور سرکاری ہسپتالوں کا رُخ کرتے ہیں۔ اگرچہ مظفر گڑھ میں ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر اور تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتالوں کے علاوہ دیگر کئی ہیلتھ یونٹس موجود ہیں، مگر مجموعی طور پر تمام ضلع بھر میں علاج کی سہولتوں کا فقدان ہے۔

مظفر گڑھ ضلع میں 7 بڑے سرکاری ہسپتال موجود ہیں، جبکہ ڈسپنسریز کی تعداد 44 ہے۔ صحت کے دیہی مراکز کی تعداد صرف 15 جبکہ بنیادی صحت کے مراکز کی تعداد 77 ہے۔ خواتین اور بچوں کی صحت کے حوالے سے بھی سرکاری اور نجی ہسپتالوں میں سہولیات کا فقدان ہے جس کی وجہ سے کئی قیمتی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ ضلع بھر کے سرکاری ہسپتالوں میں جدید مشینری کی عدم دستیابی ہے۔ کوئی بھی بڑا ٹیسٹ مریض کا کرنا ہو تو ملتان ریفر کیا جاتا ہے۔

حل

شہریوں کی خیال ہے کہ صحت کے حوالے سے اوپر دیئے گئے تمام اعداد و شمار کو فوری طور پر دو گنا کرنے کی ضرورت ہے تا کہ عوام الناس کو صحت کی عمدہ سہولتیں فراہم ہو سکیں۔ ضرورت اس اَمر کی ہے کہ ضلع بھر کے مقامی ہسپتالوں کو جدید مشینری اور سازوسامان سے آراستہ کیا جائے۔ کم از کم ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر کی سطح پر یہاں دل اور کینسر کے ہسپتالوں کا قیام بھی از حد ضروری ہے۔

خواتین اور بچوں کی صحت کے مسائل کے حوالے سے ضرورت ہے کہ طبی سہولیات کو یونین کونسل کی سطح تک فی الفور لے کر جایا جائے۔ میڈیا، سیاسی رہنماؤں اور غیر سرکاری تنظیموں کے اہلکاروں کو اس سلسلہ میں ضلعی حکومت اور محکمہ صحت کے اہلکاروں کے ساتھ مسلسل رابطے اور کام کرنے کی ضرورت ہے۔

زراعت سے جڑے مسائل

ضلع مظفر گڑھ دو دریاؤں کی سرزمین ہے۔ بند نہ ہونے یا پھر خستہ بند ہونے کی وجہ سے یہاں سیلاب کا معمول رہتا ہے۔ دریائی علاقہ میں جہاں کماد، گندم اور کسی حد تک چاول کی فصلیں جو مقامی زرعی معیشت میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں، وہ اکثر سیلاب کی زد میں آئی رہتی ہیں۔ فصلوں کے ساتھ ساتھ مویشی بھی سیلاب میں بہہ جاتے ہیں۔

یہاں کی انسان آبادی اور زرعی زمینوں کو دریا کے کٹاؤ کا سامنا بھی رہتا ہے۔ مجموعی طور پر یہاں کاشت کاری کے لیے جدید زرعی آلات کا استعمال کم ہوتا ہے۔ کماد کی چھلائی اور کٹائی اور گندم کی کٹائی کے روایتی طریقے رائج ہیں، جس کی وجہ سے فصل پر خرچہ زیادہ اُٹھتا ہے اور کسان کو منافع کم ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ضلع میں شوگر ملز سے کسانوں کو عام شکایت ہے کہ وہ کماد کی فصل کے بھاؤ اور تول میں نقصان کرتی ہے۔

حل

ضلعی حکومت کو صوبائی محکمہ سمال ڈیمز کی سفارشات پر عمل کرتے ہوئے ضلع بھر کے ان حساس مقامات پر بند باندھنے کی ضرورت ہے جو دریائی کٹاو کے خطرے سے دوچار رہتے ہیں۔ تاحال اس معاملہ پر کوئی حرکت دیکھنے کو نہیں ملی تو شہریوں کو ضلع بھر میں اس سلسلہ میں اک تحریک چلانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ سیلاب سے مسلسل ہو جانے والے نقصان کا ازالہ ممکن ہو سکے۔

نیز محکمہ زراعت کو آگے بڑھ کر بہت تحرک سے مقامی اور چھوٹے کسانوں کو جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ فی ایکڑ پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ دیکھا جاسکے۔ کماد کے کاشتکاروں کی بھی انتظامی طور پر دادرسی کی جائے تاکہ شوگر ملز مالکان کی ہر سال ہونے والی زیادتیوں سے بچا جاسکے اور کسان کو معقول معاوضہ کی ادائیگی ہو سکی۔ اس سلسلہ میں متعلقہ محکموں کے ساتھ رابطہ کرنے کی اشد ضرورت ہے اور اس میں خیال ہے کہ میڈیا اک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ پانی کی تقسیم کے حوالے سے بالخصوص چھوٹے کسانوں کی شکایات کا ازالہ کیا جائے۔

پینے کے صاف پانی کا مسئلہ

ضلع مظفر گڑھ دریاؤں کی سرزمین ہے، اگرچہ بعض حصہ تھل صحرا پر بھی مشتمل ہے۔ لیکن اس شہر میں صاف پانی کا مسئلہ شہریوں کے لیے بہت پریشان کن ہے۔ زیر زمین پانی فیکٹریوں کی وجہ سے آلودہ ہو چکا ہے، اور جہاں پانی آلودہ نہیں ہے، وہ شور اور سیم زدہ ہوتا چلا جارہا ہے۔

پانی کے ذخائر مسلسل گر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ضلع بھر میں پینے کے صاف پانی کی پائپ لائنز بھی بوسیدہ اور پرانی ہوتی چلی جارہی ہیں۔

حل

مقامی حکومت پر دباؤ بڑھانا چاہیے تاکہ صاف پانے کے فلٹریشن پلانٹ لگائیں جائیں۔ اس سلسلہ میں مقامی میڈیا کو عمائدین کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ نیز، غیر سرکاری تنظیموں کو پبلک ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ اور مقامی انتظامیہ کے ساتھ مل کر ضلع بھر کے سماجی سرویز کرنے چاہئیں تاکہ اس بات کو سائنسی بنیادوں پر سمجھا جا سکے کہ کہاں کہاں پانی کی سپلائی کے مسائل موجود ہیں اور شہریوں کی اس حوالے سے ضروریات کیا ہیں۔

مسائل کو سمجھنے کے بعد ہی حل کیا جانا چاہیے تاکہ اس مرتبہ اس مسئلے کا نہایت دیرپا حل فراہم کیا جا سکے۔ شوگر ملز اور تھرمل پاور پلانٹ پانی کی اک بہت بڑی مقدار استعمال کرتے ہیں۔ ضلعی حکومت کو چاہیے کہ ان کی انتظامیہ پر یہ ذمہ داری عائد کی جائے کہ وہ اپنے اپنے علاقے کے مکینوں کو صاف پانی کی فراہمی یقینی بنائیں کیونکہ ان پراجیکٹس کی وجہ سے زیرِ زمین پانی آلودہ ہو چکا ہے یا پھر زیر زمین پانی کی سطح بہت گر چکی ہے۔ میڈیا کو اس اہم معاملہ پر پیہم رپورٹنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

زمین کی الاٹمنٹس کے مسائل

ضلع مظفر گڑھ کا شمار اُن اضلاع میں ہوتا ہے جہاں آباد کاروں کو زمینیں الاٹ کی گئی اور اسی طرح ریٹائرڈ فوجی آفیسر ان کو بھی زمینیں الاٹ کی جاتی ہیں۔ یہ سلسلہ بہت عرصے سے جاری ہے۔ بہت جگہوں پر ضلع کے قدیمی لوگ نسلوں سے آباد چلے آرہے ہیں، مگر غیر مقامی افراد کو زمینیں الاٹ کر کے انہیں ان کی آبائی جگہوں سے بے دخل کیا جارہا ہے۔

حل

میڈیا، سیاسی رہنماؤں اور غیر سرکاری تنظیموں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ضلع بھر میں فوج اور آباد کاروں کی الاٹمنٹ کے سلسلے کو روکنے کے لیے صوبائی اور وفاقی حکومتوں پر قانون سازی اور پھر اس قانون کو لاگو کرنے کے لیے دباؤ بڑھایا جائے اور اس کام کے Facts and Figures کی مددلی جائے جس کے لیے مقامی طور پر سرویز کیے جانے چاہیں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ سماجی طور پر تناؤ اور بعد از تشدد کے معاملات کی روک تھام کے لیے مقامی لوگوں کو زمینوں میں حصہ دیا جائے اور ضلعی حکومت، تھل ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے ساتھ مل کر اپنا مؤثر کردار ادا کرے۔ زمینوں کے سروے کیے جائیں اور جہاں جہاں پر قبضہ مافیا موجود ہے، اس کا قلع قمع کیا جائے۔

ماحولیاتی آلودگی کا مسئلہ

مظفر گڑھ شہر کا ایک بڑا مسئلہ ماحولیاتی آلودگی بھی ہے کہ اس ڈسٹرکٹ میں دو بڑی شوگر ملز، کئی کاٹن فیکٹریاں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تھرمل پاور پراجیکٹس بھی ہے۔ ساتھ ہی میں شہر میں ہیوی ٹریفک کا دباؤ بھی تقریبا24 گھنٹے ہی رہتا ہے۔

حل

شوگر انڈسٹری سے پھیلنے والی آلوگی کی روک تھام کے لیے شوگر ملز مالکان کو ذمہ دار قرار دے کر، اس کا حل نکالا جائے اور سرکاری ماحولیاتی پیمانوں کو سختی سے لاگو کیا جانا چاہیے۔ شوگر انڈسٹری کے فضلہ کا خاتمہ کیا جائے اور اس فضلے کو روایتی طریقے سے ٹھکانے لگانے کی بجائے جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے ٹھکانے لگایا جائے۔ ابھی تک یہ صنعتیں اپنے فضلے کو یا تو نہروں، دریاؤں، نالوں میں بہا دیتی ہیں یا پھر انہیں زمین میں دبا دیتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں یہ رویہ ٹھیک نہیں۔

ضلعی حکومت کو چاہیے کہ اس پریکٹس کو روکے، اور ہر حال میں روکے۔ یہ شہر دریائی علاقہ وسیع پیمانے پر رکھتا ہے، اس لیے دریائی پانی کو بھی آلودگی سے بچایا جائے۔ کاٹن انڈسٹری اور تھرمل پاور پراجیکٹس اور شوگر ملز کے زہریلے مواد کی روک تھام کے لیے جدید مشینری کا استعمال کیا جائے۔ پورے ضلع میں بہت تیزی سے شجر کاری کو فروغ دیا جائے اور اس سلسلہ میں متعلقہ محکموں کے ساتھ مل جل کر کام کیا جانا چاہیے۔

مذہبی انتہاپسندی کا مسئلہ

اس ضلع میں مذہبی سطح پر اک شدت والی تقسیم بھی موجود ہے۔ شیعہ اور دیوبندی طبقات ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار رہتے ہیں جس کی وجہ سے امن و امان کے مسائل تقریباً تمام سال ہی رہتے ہیں، مگر یہ مسائل مختلف مذہبی تہواروں پر اک دم ہی شدت اختیار کرتے ہوئے بڑھ جاتے ہیں۔

حل

اس سلسلہ میں شہریوں کی رائے ہے کہ ہر قسم کی منافرت پھیلانے والی ہر مذہبی انتہاپسندی تنظیم پر فوری طور پر پابندی لگانا ہوگی تاکہ ضلع اور سماج کا امن و امان قائم رہے اور شہری کسی خوف کے بغیر اپنی زندگی گزار سکیں۔ انتظامی طور پر اس مسئلہ کو حل کرنے کی ضرورت کے ساتھ ساتھ، میڈیا اور غیر سرکاری تنظیموں کو بھی آگے بڑھ کر اپنا کردار ادا کرتے ہوئے مذہبی رہنماؤں اور تنظیموں کو امن اور آشتی کی تربیت فراہم کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے ضلعی حکومت کو ایسی فضا قائم کرنی چاہیے جس میں غیر سرکاری تنظیمیں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں۔

قانون نافذ کرنے والے اداروں کا فرض ہے کہ وہ مساجد و امام بارگاہ میں نفرت انگیز تقاریر اور مواد پر پابندی لگائیں اور مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھتے ہوئے انہیں مذہبی رواداری اور سماجی ہم آہنگی کی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے کہتے رہیں۔ عین یہی کام میڈیا اور غیر سرکاری تنظیموں کو بھی کرنا چاہیے مگر ضلعی حکومتیں ان پر کام کرنے کے حوالے سے پابندیاں لگاتی ہیں۔

تعلیم کا مسئلہ

ضلع مظفر گڑھ میں سرکاری تعلیمی ادارے سکولوں اور کالجوں کی شکل میں تو موجود ہیں، مگر یونیورسٹی ایک بھی نہیں ہے۔ ضلع بھر میں 1765 سکول اور 14 کالجز ہیں۔ یہاں کے نجی تعلیمی ادارے جنوبی پنجاب میں شہرت کے حامل ہیں، مگر یہ شہرت سے سرکاری تعلیمی ادارے محروم ہیں۔ یہاں کے طلبا اعلیٰ تعلیم کے لیے ملتان، بہاول پور اور دیگر شہروں کا رُخ کرتے ہیں۔

سرکاری تعلیمی اداروں میں معیار تعلیم بھی ناقص ہے۔ اس کے علاوہ ضلع بھر کی غربت کی وجہ سے سکولوں سے ڈراپ- آؤٹ ریٹ بھی پچھلے دس برس میں بڑھتا ہوا دیکھنے میں آیا ہے۔ غیر سرکاری تنظیمیں کہتی ہیں کہ ضلع میں یہ سطح تقریباً 40 فیصد تک ہے۔

حل

ضلع کے ہیڈکوارٹر شہر میں یونیورسٹی کا قیام یقینی بنایا جائے اور پھر اس یونیورسٹی کے سب-کیمپس تمام تحصیلوں میں قائم کیے جائیں تاکہ متوسط طبقے کے طلباء، بالخصوص خواتین کو اپنے ہی شہر میں اعلیٰ تعلیم مل سکے اور وہ دوسروں شہروں میں مالی آسودگی نہ ہونے کی وجہ سے نہ جاسکنے پر اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو منقطع کرنے پر مجبور نہ ہوں۔

یونیورسٹی کے قیام کے لیے مقامی عمائدین، میڈیا، غیر سرکاری تنظیموں اور سیاسی افراد کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اور ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دینا چاہیے کہ موجود سرکاری تعلیمی اداروں میں بہت سارے ایسے ہیں، جہاں اساتذہ کی کمی اور فرنیچر اور عمارتوں کی خستگی اور عدم دستیابی کے مسائل بھی ہیں، ان کو بھی ختم کیا جانا چاہیے۔ بچوں کے ڈراپ- آؤٹ ریٹ کو کم یا ختم کرنے کے لیے ضلعی محکمہ تعلیم کے ساتھ مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

خواتین کے مسائل

یہاں کی خواتین کو دو طرح کے مسائل کا سامنا ہے۔ کچے کے علاقے میں کم عمری کی شادیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ اس ضلع میں وٹہ سٹہ کی شادی، غیرت کے نام پر قتل، فرسودہ روایات، اور خواتین کو جائداد میں حصہ نہ دینے کی قباحتیں بہت زیادہ ہیں۔ بالخصوص مظفر گڑھ شہر میں جنسی ہراسگی، خواتین پر تشدد کے واقعات رپورٹ ہوتے رہتے ہیں۔ مختاراں مائی کا واقعہ، ملک و بین الاقوامی سطح پر جانا گیا تھا۔ وہ اسی ڈسٹرکٹ کی تحصیل جتوئی کا واقعہ تھا۔ خواتین کے حوالے سے جاگیردارنہ سوچ پائی جاتی ہے اور پورے ضلع کے ساتھ ساتھ، خود مظفر گڑھ شہر میں ہی خواتین کو روزگار کے مواقع دستیاب نہیں۔

حل

کم عمر بچیوں کی شادیوں کی روک تھام کے لیے قانون تو موجود ہے، مگر اس کو لاگو نہیں کیا جاتا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی تربیت کی ضرورت ہے کہ ایسے تمام مواقع پر پہنچ کر بچیوں کی کم عمری کی شادیوں کی سختی سے روک تھام کی جائے اور ذمہ داران کو قانون کے مطابق ڈیل کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مقامی مذہبی علماء کی خدمات لی جانی چاہئیں کیونکہ اس مسئلہ کی اک مذہبی حساسیت بھی ہے۔ نیز وٹہ سٹہ کی شادی کے کلچر کی سختی حوصلہ شکنی کی جائے، کیونکہ اس سے گھریلو تشدد کے واقعات اکثر اوقات سامنے آتے ہیں اور پھر گھریلو تشدد کی روک تھام کے لیے سرکاری اداروں اور غیر سرکاری تنظیموں کو اک سرگرم کردار ادا کرنا چاہیے۔

اس سلسلہ میں ضلعی حکومت کو بھرپور مدد فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ بااثر طبقات جو خواتین کو وراثت سے محروم کرتا ہیں، انہیں قانون کے کٹہرے میں لایا جائے، اور اک بار پھر، اس ضمن میں مذہبی علماء کو کردار ادا کرنا چاہیے۔ خواتین کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کیے جائیں اور گھریلو صنعتوں کو فروغ دے کر خواتین کی ہنرکاری سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ اس سلسلہ میں غیر سرکاری تنظیموں کو چھوٹے پیمانے پر کاروباری تربیتوں کے اہتمام کی ضرورت ہے۔ بین الاقوامی امدادی اداروں کے ساتھ مل کر علاقے کی خواتین کی حالت کو مزید بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

سیوریج اور سڑکوں کی ٹوٹ پھوٹ

ضلع بھر کا، اور بالخصوص مظفر گڑھ شہر کا سیوریج سسٹم ناکارہ، بوسیدہ اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہے۔ مظفر گڑھ شہر کی گلیاں اور سڑکیں گندے پانی سے بھری رہتی ہیں اور کچھ ایسے ہی حالات اس کی نواحی تحصیلوں اور دیگر قصبات کے بھی ہوتے ہیں۔ بارش کے

موسم میں سڑکیں ندیاں اور تالاب بن جاتی ہیں۔ نیز پینے کے صاف پانی کے پائپ سیور یج کے ساتھ ساتھ ایک ہی رستوں پر بچھے ہوئے ملتے ہیں۔ بہت افسوس کی بات یہ ہے کہ شہر بھر کا گندہ پانی دریاؤں میں ڈالا جاتا ہے۔ شہر کی اندرونی سڑکیں زیادہ تر یک-رویہ ہیں، جس کی وجہ سے ٹریفک حادثات روزانہ کا معمول بن چکے ہیں۔ اکثراالاوقات حادثات کا شکار لوگ صحت کی بھرپور سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے موت کے مونہہ میں چلے جاتے ہیں۔ صرف مظفر گڑھ شہر اور اس کے آس پاس کی ہی نہیں، اس شہر کو باقی اضلاع اور خود اپنے ہی ضلع کے دوسرے علاقوں سے ملانے والی سڑکیں بھی یک-رویہ ہیں اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار بھی ہیں۔

حل

سیور یج کے انفراسٹرکچر کو ٹھیک کیا جائے، اس کے لیے ضلعی حکومت اور تحصیل حکومتوں کو اپنی ذمہ داریاں مسلسل نبھانے کی ضرورت ہے۔ گو کہ وہ اس معاملہ پر عمومی سستی کا شکار دکھائی دیتی ہیں، مگر شہری، میڈیا اور غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ مل کر اس صورتحال میں بہتری پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ صوبائی اور قومی سطح کے سیاسی رہنماؤں اور عمائدین کے ساتھ مل کر بھی ضلعی حکومت پر دباؤ ڈالا جاسکتا ہے کہ وہ اس مسئلہ پر نہ صرف توجہ دے بلکہ پورے ضلع بھر میں اسے حل بھی کرے۔

ایسے ہی وفاقی محکمہ شاہرات تک شہریوں کو رسائی حاصل کر کے مظفر گڑھ شہر اور ضلع میں سڑکوں کو دو-رویہ کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے، ان سڑکوں کو دو-رویہ کروایا جانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ممبران قومی اسمبلی، میڈیا اور غیر سرکاری تنظیموں کو مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

وہاڑی

تعارف

وہاڑی کو یکم اپریل 1976ء میں ضلع کا درجہ دیا گیا۔ ضلع میں تین تحصیلیں جن میں بورے والا، میلسی اور وہاڑی ہیں۔

ضلع وہاڑی میں اردو اور پنجابی بڑی زبانیں ہیں۔ لیکن یہاں کی بڑی زبان پنجابی ہے۔

وہاڑی کپاس کے حوالے سے مشہور ہے۔ وہاڑی کو سٹی آف کاٹن (کپاس کا شہر) کہا جاتا ہے۔ وہاڑی کا موسم گرم اور خشک ہوتا ہے۔ وہاڑی کی زرخیز زمین فصلوں کے لیے کافی مفید ہے اور یہاں کپاس اور گنے کی چھوٹی اور بڑی فیکٹریاں موجود ہیں۔ یہاں کے باغات میں آم کافی مقدار میں پیدا ہوتا ہے اور یہاں کی یہ اک بر آمدی فصل بھی شمار ہوتی ہے، گو کہ ضلع بھر کی پیداوار ضلع ملتان میں آم کی پیداوار کے مقابلے میں کم ہے۔ ضلع وہاڑی میں آم کے علاوہ کینو اور امرود کے باغات بھی ہیں۔

1998ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 2,090,416 نفوس پر مشتمل تھی۔ جبکہ 2017 کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 2,897,446 ریکارڈ کی گئی۔ اس شہر کی آبادی تیزی سے بڑھی ہے۔ جس سے کئی طرح کے مسائل نے جنم لیا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے سامنے ضلعی سطح پر انفراسٹرکچر اس کا بوجھ اٹھانے سے روز بروز قاصر محسوس ہوتا چلا جارہا ہے۔

وہاڑی میں قومی اسمبلی کے 4 حلقے ہیں۔ این اے 162 تا 165، جب کہ صوبائی اسمبلی کے 8 حلقے ہیں۔ پی پی 229 تا 236۔

وہاڑی کے سیاسی خاندان

دولتانہ خاندان

دولتانہ خاندان کے جس شخص نے قیام پاکستان سے پہلے سیاست میں نام کمایا وہ میاں احمد یار خان دولتانہ تھے۔ وہ 26، 1920 اور 1930 میں پنجاب کی قانون ساز کونسل اور 1937 میں دو نشستوں میں پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ان کی ایک چھوڑی ہوئی نشست پر ان کے بھائی میاں اللہ یار خان دولتانہ منتخب ہوئے۔ میاں احمد یار خان دولتانہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے، میاں ممتاز دولتانہ 1947 میں پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد نواب افتخار حسین ممدوٹ وزیر اعلی منتخب ہوئے تو ممتاز دولتانہ ان کی کابینہ میں ویزِر خزانہ رہے۔ بعد ازاں یہ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ بن گئے۔

میاں ممتاز دولتانہ کے بیٹے میاں جاوید ممتاز آئی جے آئی کے علاوہ پہلے پی پی پی میں رہے۔

میاں اللہ یار خان دولتانہ کے بیٹے ریاض احمد خان دولتانہ 1970 میں پی پی پی کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی، 1977 میں بھی یہ کامیاب رہے۔ ضیا کے دور میں یہ ان کے ساتھ مل گئے اور مجلس شوریٰ کے رکن بن گئے۔ میاں ریاض کے بیٹے میاں زاہد خان دولتانہ کے بیٹے ہیں۔ ان کی بہن اور میاں ریاض احمد خان دولتانہ کی بیٹی تہمینہ دولتانہ ہیں۔

کچھی خاندان

دلاور کچھی ایم این اے اور ایم پی اے 1980-1990 تھے اور ان کے بیٹے ممتاز کچھی (اس قبیلے کے سربراہ) 28 سال مسلسل منتخب ناظم رہے اور ان کا بیٹا آفتاب کچھی 2002 میں ایم این اے تھا، ان کے بھائی شہزاد کچھی 2013 میں ناظم تھے۔

خاکوانی

نواب اسحاق خاکوانی 2002 میں وزیر ریلوے رہے۔ ان کے بھتیجے احسن خاکوانی 2002 میں ایم پی اے اور ان کے بھائی شہریار خاکوانی نے سیاست میں قدم رکھا۔

میاں خورشید انور

میاں خورشید انوار مرحوم 1980-1990 کے درمیان ایم پی اے رہے اور میاں ثاقب خورشید موجودہ ایم پی اے اور ان کے بھائی آصف خورشید نے ناظم کے لیے الیکشن لڑا لیکن ہار گئے۔ آصف کی اہلیہ نفیسہ آصف دو بار ایم پی اے منتخب ہوئیں۔ ان کے بیٹے میاں نریب خورشید نے سیاست میں قدم رکھا۔

صحت کے مسائل

ضلع وہاڑی میں صحت کے مسائل کا اک انبار ہے۔ اس بات سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس بڑے ضلع میں سرکاری سطح کے صرف 3 بڑے ہسپتال موجود ہیں، صرف 3۔ یہاں سرکاری ڈسپنسریوں کی تعداد 40 ہے جبکہ صحت کے دیہی مراکز 14 ہیں۔ صحت کی ہی سہولیات میں صحت کے بنیادی مراکز کی تعداد 74 ہے۔ ملتان کے قریب ہونے کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کی ضلعی حکومت، سیاسی رہنماؤں اور مقامی محکمہ صحت کو اس بات کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ یہاں صحت کی سہولیات کے حوالے سے اک قابل بھروسہ نظام تشکیل دیا جائے۔

صحت کے معاملات خواتین اور بچوں کے حوالے سے مزید دگرگوں ہیں۔ خواتین کے لیے صحت کا کوئی خاص مرکز موجود نہیں اور اسی طرح بچوں کی بیماریوں کے حوالے سے بھی کوئی خاص ہسپتال موجود نہیں۔ -بڑے سرکاری ہسپتالوں میں زنانہ وارڈ کی سہولت تو موجود ہے مگر مسلسل بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے موجودہ سہولیات شدید ناکافی ہو چکی ہیں۔ پورے ضلع کی کیا بات کی جائے، ضلعی ہیڈکوارٹر میں ہی خواتین کے علاج معالجے اور زچہ وبچہ کے امراض کی تشخیص اور علاج کی سہولیات ناکافی ہیں۔

تحصیل ہیڈکوارٹرز اور پھر دور دراز کے قصباتی مراکز میں حالات مزید خراب ہیں۔ اور بدقسمتی یہ ہے کہ ایسا اک طویل عرصے سے چلا آ رہا ہے۔

اس کے علاوہ سرکاری ہسپتالوں میں ادویات کی کمی کی بھی مسلسل شکایات رہتی ہیں۔

حل

شہریوں کا خیال ہے کہ ضلع اور تحصیل کے صدر مقامات پر موجود سرکاری ہسپتالوں میں وسعت کی شدید ضرورت ہے اور انہیں موجود آبادی کے تناسب سے اپ-گریڈ کیا جانا چاہیے۔ ان ہسپتالوں میں میڈیکل مشینری کے حالات بھی خراب ہیں اور مشینوں کی مرمت کی فوری ضرورت ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ضلع میں فی کس آمدنی علاقے کے دوسرے بڑے شہروں کے مقابلے میں کم ہے اور تشخیص وعلاج بذریعہ مشین کی خرچہ سرکاری ہسپتالوں سے باہر ہر کسی کے بس میں نہیں ہے۔

مشینوں کی مرمت اور ان کو دوبارہ سے آپریشنل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مقامی عمائدین اور شہری تنظیمیں محکمہ صحت اور ضلعی حکومت کے ساتھ مل کر کام کریں اور بالخصوص ضلعی حکومت کو یہ باور کروائیں کہ ضلع بھر میں آبادی کے اگلے دس برس کے تناسب کے لحاظ سے طبی شعبہ کو اپ-گریڈ کیا جانا چاہیے۔

ضلعی سطح پر تو سی ٹی سکین اور ایم آئی آر کی سہولت موجود ہے، مگر ناکافی ہے۔ ضلع کی کسی تحصیل کے کسی بھی سرکاری ہسپتال میں یہ مشینیں موجود نہیں ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ضلعی سطح پر سرکاری ہسپتال میں مشینوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور تحصیل کی سطح پر یہ مشینیں مہیا کی جائیں۔

صحت کی سہولیات خواتین کو باہم پہنچانے کے لیے ضلعی اور تحصیل کی سطح پر زنانہ ہسپتال قائم کیے جانے چاہیئں تاکہ خواتین کی صحت کے مسائل حل ہو سکیں۔ کسی زمانے میں ماں اور بچے کی صحت کے پروگرام ضلعی اور صوبائی حکومتوں کے تحت چلا کرتے تھے۔ علاقے میں اس پروگرام کو نہیں دیکھا جارہا۔ شہری اور غیر سرکاری تنظیموں کا یہ فرض ہے کہ وہ علاقے کے لوگوں کی اس معاملہ میں دادرسی کروائیں اور ضلعی حکومت کے ساتھ ساتھ محکمہ صحت کے ساتھ اس سلسلہ میں مل جل کر کام کریں۔

ضلعی حکومت کا یہ بھی فرض بنتا ہے کہ وہ نجی شعبہ میں چلنے والے ہسپتالوں میں ضرورت مند مریضوں کا اک کوٹہ مقرر کروائیں کہ جنہیں رعایتی نرخوں پر صحت کی سہولیات مہیا ہو سکیں۔

ضلع بھر کے سرکاری ہسپتالوں میں ادویات کی ترسیل و فراہمی کا نظام بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی شہری عمائدین اور غیر سرکاری تنظیموں کو آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ مقامی سیاسی رہنماؤں پر بھی اس سلسلہ میں دباؤ بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ صوبائی حکومت کے ساتھ مل کر علاقے میں صحت کی سہولیات کو بہتر سے بہتر بنا سکیں۔

خواتین کے مسائل

ضلع وہاڑی میں خواتین پر گھریلو تشدد کے واقعات تواتر سے رپورٹ ہوتے رہتے ہیں۔ خواتین کے ساتھ جنسی زیادتی اور انہیں ہراساں کرنے کے واقعات میں بھی تسلسل دیکھا جاتا ہے۔ یہاں پر متاثرہ خواتین کے لیے کسی زمانے میں ان کی بحالی کا اک نیم سرکاری ادارہ قائم کیا گیا تھا، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدحالی اور تنزلی کا شکار ہوتا چلا گیا۔ اب وہ ادارہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ صرف کاغذوں میں موجود رہ گیا ہے۔

خواتین کو قانونی مسائل کا بھی سامنا ہے۔ خاندانی مسائل جو عدالتوں میں چلتے ہیں، ان کی پیروی کرنے کے لیے خواتین کو مسلسل تشدد کا خوف رہتا ہے۔ خواتین کو خصوصی قانونی مدد فراہم کرنے کے لیے مقامی پولیس کے تھانوں میں خواتین سٹاف تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔

اک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر متاثرہ خاتون کا تعلق دیہاتی علاقے یا غریب خاندان سے ہے تو اس کے لیے قانونی مدد مزید مشکل ہوتی چلی جاتی ہے۔

حل

ہمارے ہاں قوانین تو بہت ہیں مگر ان پر عمل درآمد کی صورتحال دگرگوں ہے۔ خواتین کے بارے بنائے گئے قوانین پر عملدرآمد بذریعہ پولیس، عدلیہ اور انتظامیہ کیا جائے اور بالخصوص تشدد کی شکار خواتین کے کی نفسیاتی بحالی کے لیے بھی ضلعی حکومت کوششیں کرے۔ اس سلسلہ میں وہاڑی میں موجود غیر سرکاری تنظیمیں آگے بڑھیں اور قومی اور بین الاقوامی امدادی اداروں کے ساتھ مل کر خواتین کے حقوق پر مقامی لوگوں کی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے تشدد اور ہراسگی سے متاثر خواتین کی دادرسی اور بحالی کے لیے کوششیں کریں۔

ضلع کی سطح پر خواتین کی نفسیاتی اور طبی بحالی کا جو ادارہ قائم تھا، اسے دوبارہ سے فعال کرنے کی ضرورت ہے اور مقامی خواتین رہنماؤں کا یہ فرض ہے کہ اس سلسلہ میں وہ ضلعی حکومت سے رابطہ کر کے اس ادارے کے لیے فنڈز کا اہتمام کروائیں۔ اسی سلسلہ میں انہیں چاہیے کہ مقامی سطح پر منتخب صوبائی اسمبلی کے ممبران کے ذریعے خواتین کے اس مرکز کی بحالی کو یقینی بنایا جانا جائے۔

خواتین پر تشدد پر کمی یا خاتمے کے لیے اک بار پھر غیر سرکاری تنظیموں کو آگے بڑھ کر اپنا کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ انہیں چاہیے کہ وہ سماجی سطح پر ضلع کے شہری اور بالخصوص دیہاتی پس منظر رکھنے والے علاقوں میں سماجی سطح پر آگاہی سیشنز کا انعقاد کریں اور اس سلسلے میں والدین، مقامی کمیونیٹیز اور سرکاری اداروں کو بھی ساتھ ملایا جائے۔

شہریوں کا خیال ہے کہ اگر خواتین کو روزگار کے لحاظ سے خودکفیل اور ہنرمند بنایا جائے تو ان پر تشدد کے واقعات میں خاطر خواہ کمی لائی جا سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ضلعی حکومت کو اقدامات کرنے چاہیئں اور مزید یہ کہ خواتین کو بالخصوص چھوٹے کاروبار کی تربیت کے لیے مقامی چیمبر آف کامرس کو اک کلیدی کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔

ماحولیات کے مسائل

وہاڑی ضلع گو کہ زرعی معیشت رکھنے والا ضلع ہے تو اس کے چھوٹے قصبات اور دیہاتی علاقوں میں آب وہوا اور ماحولیات کے اتنے مسائل دیکھنے کو نہیں ملتے، مگر ضلعی اور تحصیل ہیڈکوارٹر کے شہروں کے اس حوالے سے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

وہاڑی شہر اور بڑے قصباتی مراکز کے ارد گرد چھوٹی بڑی فیکٹریاں تو ہیں ہی، ضلعی شہر اور تحصیل کے قصبات کے اندر اور ان کے آس پاس دھواں چھوڑتی ٹریفک کی وجہ سے ان شہروں کی اندرونی آب و ہوا شدید کثیف ہو چکی ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں بیماریاں بڑھ رہی ہیں۔

علاوہ ازیں وہاڑی شہر اور تحصیل کے مراکز میں جگہ جگہ کچرے کے ڈھیر نظر آتے ہیں اور پلاسٹک کے شاپنگ بیگ بھی بڑی تعداد میں کوڑے میں شامل نظر آتے ہیں۔

حل

وہاڑی شہر اور ضلع کے تحصیل مراکز میں چنگ چی رکشہ اور دھواں چھوڑتی گاڑیوں کے داخلہ پر فوری طور پر پابندی لگائی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ٹریفک پولیس کے ذیلی محکمہ، جو گاڑیوں کی سالانہ چیکنگ کے بعد چلنے کا سرٹیفیکیٹ جاری کرتا ہے، کو سرگرمی سے ان شہروں میں چلنے والی گاڑیوں کی کوالٹی پر غور کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں ضلعی حکومت کے ذیلی محکمہ ماحولیات پر مثبت سیاسی، سماجی و معاشرتی دباؤ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ عام مشاہدے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ سرکاری محکمے اور اہلکار ماحولیات کے مسائل کو مسائل ہی نہیں سمجھتے۔ یہ رویہ ٹھیک نہیں۔ اس سلسلے میں مقامی میڈیا اور غیر سرکاری تنظیموں کے نمائندوں کو بھی آگے بڑھنا چاہیے۔

ضلعی انتظامیہ کو اسلام آباد کی طرز پر پلاسٹک کے شاپنگ بیگز کی پیداوار اور استعمال پر فوری پابندی عائد کرنی چاہیے۔ جب کہ کچرے کے ڈھیروں سے نجات حاصل کرنے کے لیے بلدیہ کے ذیلی محکمہ سینیٹیشن کو عملی طور پر کام کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں مقامی سیاسی قیادت جو گلی محلے میں موجود ہوتی ہے ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ، صفائی اور گندگی کے معاملات پر لوگوں کی مثبت ذہن سازی کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے۔

امن و امان کا مسئلہ

ضلع بھر کے دیہاتوں میں لڑائی جھگڑے عام ہیں اور اسی طرح تعلیمی اداروں میں طلباء تنظیموں کے مابین جھگڑے بھی معمول کا حصہ ہیں۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ بورے والا تحصیل میں صرف ایک سال کے دوران 10 طلباء مارے جا چکے ہیں۔ یہاں مذہبی شدت پسندی موجود تو ہے، مگر اس سے جڑے ہوئے تشدد کے واقعات کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ زیادہ تر جھگڑے جو امن عامہ کے مسائل میں ڈھلتے ہیں، وہ دیہاتی پس منظر کے علاقوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

سماجی ہم آہنگی کے پروگرام موجود نہیں اور پولیس بھی عام طور پر مصالحتی کمیٹیوں سے کوئی عملی کام لیتی نظر نہیں آتی۔ یہ کام عموماً غیر سرکاری تنظیمیں سرانجام دیتی ہیں، مگر ضلعی حکومت انہیں کام کرنے کی عمومی اجازت نہیں دیتی۔

ان تمام کی وجہ سے معاشرے کا تار و پو بکھر رہا ہے۔

حل

دیہاتی پس منظر میں عام طور پر خاندانی نوعیت کے جھگڑوں کے خاتمے کے لیے ضروری ہے پولیس اور قانون نافذ کرنے والے دوسرے ادارے مصالحتی کمیٹیوں سے سماجی مدد حاصل کریں اور ساتھ ساتھ میں غیر سرکاری تنظیموں کہ سماجی ہم آہنگی کے رویوں کو فروغ دینے کے لیے آگاہی پروگرام شروع کیے جائیں۔ اس سلسلے میں ضلعی حکومت کے ساتھ معاشرتی طور پر اعتماد سازی کے لیے مقامی میڈیا کو ان کی مدد کرنی چاہیے تاکہ سماجی ہم آہنگی کے معاملات بھی معاشرتی گفتگو میں برابری کا حصہ حاصل کر سکیں۔

شہریوں کا بہت مضبوط خیال ہے کہ تعلیمی اداروں میں جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے تعلیمی اداروں کی انتظامیہ اپنی ذمہ داری کا مظاہرہ کرے اور کسی قسم کی سیاسی یا مذہبی تنظیم کو تعلیمی اداروں میں منفی مداخلت کی اجازت نہ دی جائے۔ طلباء کو امن و آشتی کے فروغ سے جڑی سرگرمیوں میں شامل کیا جائے اور اس سلسلے میں مقامی انٹیلیکچوئلز اور میڈیا کی مدد سے غیر سرکاری تنظیمیں مقامی اور بین الاقوامی امدادی اداروں سے پراجیکٹس کے لیے مدد حاصل کرنے کی کوششیں کریں۔

اسی طرح ضلع میں موجود مذہبی انتہا پسندی کے خطرات سے نبٹنے کے لیے غیر سرکاری تنظیمیں، مقامی میڈیا، انٹیلیکچوئلز اور سیاسی و سماجی رہنماؤں کے ہمراہ مقامی مذہبی رہنماؤں کے ساتھ کام کے آغاز کریں اور ان کے ذریعے نوجوانوں کو رواداری پر مبنی لٹریچر فراہم کیا جائے اور انہیں امن سے جڑے معاملات کی تربیت فراہم کی جائے۔

تعلیم کے مسائل

ضلع وہاڑی تعلیمی سطح پر کئی طرح کے مسائل کا شکار ہے۔ اس وات ضلع وہاڑی میں 25 ہائر سیکنڈری تعلیمی ادارے، 214 ہائی سکول، 249 مڈل سکول، اور 937 پرائمری سکول موجود ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق یہاں کل 24 کالجز ہیں جن میں سے 13 لڑکیوں کے لیے اور 11 لڑکوں کے لیے ہیں۔ وہاڑی میں ایک دو یونیورسٹیوں کے سب۔کیمپسز تو موجود ہیں، مگر وہاڑی کی اپنی یونیورسٹی موجود نہیں جس کی وجہ سے بالخصوص اعلیٰ تعلیم کی لگن رکھنے والے لڑکیوں کو مزید تعلیم کے حصول میں شدید دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اسی طرح ضلع میں چھوٹی بڑی صنعتیں موجود تو ہیں، مگر ان صنعتوں سے جڑی ہوئی مہارتوں کی تربیت فراہم کرنے کے کوئی قابل ذکر ادارے موجود نہیں۔ نوجوانوں اور خواتین کو فنی اور پیشہ وارانہ مہارتوں کی تربیت فراہم کرنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ نہ صرف برسر روزگار ہو سکیں، بلکہ مقامی معاشرت میں پیداواری شہری بھی بن سکیں۔

حل

سکولوں کی تعداد مناسب ہے، مگر ان میں اساتذہ کی تعیناتی اور پھر معیار تعلیم کے مسائل کو حل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے لیے مقامی حکومتوں کو چاہیے کہ ضلعی محکمہ تعلیم کے ساتھ مل کر اس مسئلہ پر سنجیدہ غور و فکر اور عمل کریں۔ شہریوں کو اس سلسلہ میں سماجی عمائدین کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے اور مقامی حکومتوں پر دباؤ میں اضافہ کرنا چاہیے۔

اساتذہ کی حاضری کے بھی پرانے مسئلہ کو جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے حل کیا جانا چاہیے۔

ضلع وہاڑی میں اعلیٰ اور معیاری سطح کی یونیورسٹی کے قیام کو یقینی بنایا جائے اور اس کے لیے صوبائی اسمبلی کے ممبران کے ذریعے پنجاب کے محکمہ تعلیم کے ساتھ کام کیا جانا چاہیے تاکہ مقامی لوگوں کا یہ دیرینہ مطالبہ پورا ہو سکے اور ضلع کے نوجوان، بالخصوص خواتین، اپنی اعلیٰ تعلیم اپنے ہی ضلع میں حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں۔

فنی اور پیشہ وارانہ صلاحتیوں کی تربیت فراہم کرنے کے لیے غیر سرکاری تنظیموں کو مقامی چیمبر آف کامرس اور دیگر کاروباری حلقوں کے ساتھ مل کر ضلع میں فنی اور پیشہ وارانہ تربیت کے ادارے قائم کرنے چاہئیں اور اس بات کی مسلسل کوشش کی جانی چاہیے کہ ایسے ادارے سرکاری سرپرستی میں ان مہارتوں کی ترویج کے لیے قائم ہوں جن کی مقامی سطح پر بھی ضرورت ہے۔

میڈیا کو اس سلسلہ میں بھرپور کیمپین چلانے کی ضرورت ہے۔ مہارتیں بہتر بنانے کے جو ادارے موجود ہیں، ان کو اپ-گریڈ کیا جانا چاہیے اور ان کی اپنی قابلیتوں اور سٹرکچرز کو مزید طاقتور کیا جانا چاہیے۔

زرعی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہ بھی لازم ہے کہ یہاں اک زرعی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے جو مقامی موسموں اور فصلوں کے مطابق نئے بیج تیار کرے۔

زراعت کے مسائل

ضلع وہاڑی زراعت کے حوالے سے اک مثالی درجہ رکھتا ہے اور فصلوں کی پیداوار کے لحاظ سے یہاں کی زمین بہت زرخیز ہے۔ یہاں کی زمین کی کارکردگی مزید بہتر بنائی جا سکتی ہے اگر نہری پانی کے مسائل حل کیے جا سکیں کیونکہ طاقتور اور بااثر افراد پانی کے تقسیم پر اثر انداز ہوتے ہیں جس کی وجہ سے چھوٹا کاشتکار مسلسل نقصان اور گھاٹے میں رہتا ہے۔ کئی مرتبہ پانی کی وجہ سے جھگڑے بھی بنتے ہیں جس میں جانی و مالی نقصان کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔

مقامی اور بالخصوص چھوٹے کاشتکاروں کو ڈیزل، پٹرول اور بجلی کی میں حکومتی رعائتیں ملنی چاہئیں جو کہ نہیں مل پاتیں۔ اس سلسلہ میں محکمہ زراعت اتنا سرگرم بھی نظر نہیں آتا۔ کچھ یہی مسئلہ کھادوں کی فراہمی پر بھی ہے۔ کھادوں کے سٹاکسٹس قیمتیں مصنوعی طور پر بڑھا دیتے ہیں جس کی وجہ سے چھوٹے کسانوں پر بوجھ مزید بڑھ جاتا ہے۔

حل

نہری پانی کی فراہمی میں منصفانہ طریقہ روا رکھا جائے اور اس سلسلہ میں سرکاری ادارے کسی قسم کی سیاسی سفارشوں کو تسلیم نہ کریں۔ خیال ہے کہ اس سلسلہ میں مقامی سیاسی قیادت کو حکومتی اداروں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مقامی چھوٹے کسان کی حق تلفی نہ ہو۔ خاص طور پر وہ چھوٹے کسان جو نہروں اور کھالوں کے Tail-Ends پر موجود ہیں۔

ضلع میں چھوٹے کسانوں کو حکومت کی جانب سے پیش کردہ رعایتوں میں سے بھرپور حصہ ملنا چاہیے اور ان کے لیے ڈیزل، پٹرول اور بجلی کی مد میں رعایتی نرخ وصول کیے جانے چاہئیں۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کا فرض ہے کہ انہیں حکومتی رعایتوں میں رکاوٹ ڈالنے والے افراد اور اداروں کے خلاف کارروائی کریں اور بالخصوص بیجائی اور بعد اس فصلوں کے مختلف مراحل پر زرعی ادویات اور کھادوں کی فراہمی کے نظام کو بلیک مارکیٹ کی نذر ہونے سے بچایا جائے۔

اس سلسلے میں چھوٹے کسانوں کی اک ضلعی سطح کی تنظیم کا بنایا جانا بہت ضروری ہو چکا ہے۔ ضلع کے دیہاتی علاقے کی عمومی پسماندگی کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ غیر سرکاری تنظیمیں اس معاملہ میں شاندار مدد فراہم کر سکتی ہیں۔ ان مقامی تنظیموں کے عہدیداروں پر لازم ہے کہ وہ قومی یا بین الاقوامی امدادی اداروں کے نظر میں یہ مسائل لائیں اور ان مسائل پر فائدہ مند پراجیکٹس شروع کریں۔

متعلقہ حکومتی اداروں کو چھوٹے کاشتکاروں کے لیے ٹیوب ویل کے کنکشنز میں آسانی بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اکثر چھوٹے کاشتکار ناخواندہ ہونے کے سبب مختلف سرکاری معاملات میں کاغذی کارروائی پوری نہیں کر سکتے تو کسانوں کی قائم کردہ تنظیم، جس کی سفارش اوپر کی جا چکی ہے، اس سلسلہ میں یقیناً عمدہ مدد فراہم کرنے کے قابل ہو سکتی ہے۔

خانیوال

تعارف

خانیوال، جسے جنوبی پنجاب کا گیٹ وے بھی کہا جاتا ہے، 4 تحصلوں پر مشتمل ایک ضلع ہے جو کہ پہلے ضلع ملتان کی ایک تحصیل تھا۔ سنہ 1985 میں ملتان کی دو تحصیلیں، میاں چنوں اور کبیر والا کو خانیوال کے ساتھ شامل کر کے اس اک ضلع کا درجہ دے دیا گیا۔

تاریخی طور پر یہاں ڈاہا خاندان بہت بااثر اور مضبوط تھا اور جنہیں مقامی طور پر لوگ "خان" کہا کرتے تھے۔ انہی کی وجہ اس شہر کو خانیوال کا نام دیا گیا۔

ضلع کے مشرق میں ساہیوال، مغرب میں ملتان، شمال میں جھنگ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کے اضلاع کے علاوہ جنوب میں ضلع وہاڑی موجود ہے۔

سنہ 2017 کی مردم شماری کے مطابق خانیوال کی کل آبادی تقریبا 2.9 ملین لوگوں پر مشتمل تھی۔ اپنی آبادی کے لحاظ سے خانیوال پاکستان کا 36واں بڑا شہر ہے۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہاں پاکستان کا دوسرا بڑا ریلوے سٹیشن موجود ہے۔

پورے ضلع کا جغرافیائی رقبہ 4،349 کلومیٹر ہے اور یہاں چار مقامی زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں اک اندازے کے مطابق پنجابی کا تناسب سب سے زیادہ یعنی 81 فیصد ہے۔ دیگر زبانوں میں سرائیکی، اردو اور پشتو بولنے والی کمیونیٹیز بھی شامل ہیں۔

سابق وزیر اعلیٰ پنجاب، غلام حیدر وائیں کا تعلق خانیوال کی ہی اک تحصیل، میاں چنوں سے تھا، جب کہ مشہور مذہبی رہنما، مولانا طارق جمیل بھی اسی ضلع سے تعلق رکھتے ہیں۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ضلع میں تقریبا 24 ڈاکخانے اور 20 قومی بینکوں کی برانچیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ضلع میں 7 ٹیکسٹائل ملیں اور 1 شوگر مل بھی موجود ہے۔ چھوٹی بڑی تقریبا 71 کاٹن فیکٹریاں ہیں۔

گندم اور کپاس یہاں کی بڑی فصلیں ہیں اور مقامی طور پر موجود پانی ان فصلوں کے لیے بہت موزوں سمجھا جاتا ہے۔ پورے ضلع میں صرف 17 پولیس سٹیشن ہیں جو بہت ہی کم ہیں۔ اس کی وجہ سے ضلع میں امن و امان کے مسائل رہتے ہیں، مگر مجموعی طور پر، مقامی میڈیا کے مطابق، ضلع پر امن ہے۔

خانیوال کے سیاسی خاندان

ڈاہاخاندان

خانیوال کاڈاہاخاندان راجپوت قبیلے کی شاخ ہے۔ یہ خاندان بہت پہلے بہاولپور سے خانیوال ہجرت کر آیا تھااور اس خاندان سے میجر (ر) آفتاب احمد ڈاہاپی ایم ایل این سے دوبار ایم این اے رہے۔ حافظ عرفان احمد ڈاہاصوبائی وزیر ٹرانسپورٹ تھے۔ ان کے بیٹے محمد خان ڈاہامسلم لیگ ن سے ایم این اے ہیں، حاجی عرفان کے بھائی حاجی رضوان نے بھی ایم پی اے کی نشست پر الیکشن لڑا۔ نشاط احمد خان ڈاہاکا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے، وہ متعدد بار ایم پی اے منتخب ہوئے۔ ان کے بھتیجے مسعود مجید خان ڈاہا بھی سیاست میں ہیں۔

ہراج خاندان

مہر اقبال ہراج 1962-69 کے دوران مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے رکن اور 1988-90،1993-96 کے دوران رکن قومی اسمبلی رہے۔ پیپلز پارٹی کے سردار اللہ یار ہراج 1985 میں ایم پی اے منتخب ہوئے پہلی بار وزیر بھی رہے، ان کے صاحبزادے احمد یار ہراج ضلعی ناظم تھے اور وزیر اعظم کے مشیر ہیں۔ حامد یار ہراج پی ٹی آئی کے موجودہ ایم پی اے اور سابق چیئر مین ایرا ہیں۔ محمد یار ہراج مسلم لیگ (ق) سے سابق ایم پی اے ہیں۔ بیرسٹر رضا حیات ہراج، اللہ یار کے رشتہ دار متعدد بار ایم این اے منتخب ہوئے لیکن 2018 میں ہار گئے۔ یہ خاندان بنیادی طور پر زمیندار رہے مگر صنعتیں اور کاٹن ملز بھی ہیں۔

واہلہ خاندان

چودھری عبدالرحمن واہلہ 2 بار ایم این اے منتخب ہوئے، ان کے بیٹے چوہدری فضل داد واہلہ ایک بار ایم این اے منتخب ہوئے۔ ان کے بھائی چوہدری کرم داد واہلہ 3 مرتبہ ایم پی اے منتخب ہوئے۔ خاندان درمیانے درجے کاز میندار ہے۔

آرائیں خاندان

میاں نذیر جہانیاں ایم پی اے تھے، ان کے بھائی جاوید جہانیاں بھی سیاست میں ہیں۔ ان کے رشتہ دار چوہدری خالد نے بھی الیکشن لڑا۔ خاندان آبادکار ہے اور انہیں تقسیم ہند کے بعد زمین الاٹ کی گئی۔

میتلا فیملی

ملک مرتضٰی میتلہ 2 بار ایم این اے منتخب ہوئے۔ ان کے رشتہ دار ملک ارشد ایم پی اے تھے۔

کھگا خاندان

میاں قمر الزمان کھگہ تقسیم سے پہلے سیاست کرتے تھے، کانگریس پارٹی سے الیکشن لڑتے تھے۔ ان کے بیٹے میاں سہیل زمان نے الیکشن لڑا۔ حیات شاہ کھگا، ان کے بھتیجے محب وطن پارٹی کے چیئرمین ہیں۔ خاندان زمین کا مالک ہے اور یہ سندھ کے مشہور روحانی خاندان، پیر صاحب پگارا کے قریبی رشتہ دار ہیں۔

راجپوت خاندان

چودھری افتخار نذیر ایم این اے ہیں۔ ان کے بھائی حاجی عطاالرحمان ایم پی اے ہیں۔ چودھری. ضیاء الرحمان چیئرمین ضلع کونسل ہیں۔

سید فخر امام

ممبر قومی اسمبلی رہے ہیں اور سیاست میں سنہ 1985 سے سرگرم ہیں۔ مختلف جماعتوں کے ساتھ وابستگی رہی جس میں پاکستان مسلم لیگ-ن اور پاکستان مسلم لیگ-ق بھی شامل ہے۔ فی الوقت (2021) وہ پاکستان تحریک انصاف کے رہنما ہیں اور وفاقی وزیر بھی۔

صحت کے مسائل

صحت کی سہولیات کا بہت بڑا فقدان ہے ضلع بھر میں۔ اک بڑے ضلع میں سرکاری سطح کے صرف 6 بڑے ہسپتال موجود ہیں، جبکہ سرکاری ڈسپنسریوں کی تعداد صرف 14 ہے۔ صحت کے دیہاتی مراکز 8 جبکہ بنیادی صحت کے مراکز 82 ہیں۔

کوئی ٹراما سینٹر موجود نہیں اور کوئی برن سینٹر بھی موجود نہیں۔ خواتین کے لیے زنانہ وارڈز تو مہیا ہیں، مگر ان کے لیے پورے ضلع میں کوئی بھی ہسپتال مخصوص نہیں ہے۔ سرکاری سطح کے تمام ہسپتالوں میں سہولیات کا فقدان نظر آتا ہے۔ طبی معائنے کی مشینیں موجود نہیں ہیں اور جو مشینیں موجود ہیں، ان کی حالت ٹھیک نہیں۔ بہت سی مشینیں ناقابل استعمال حالت میں ہیں، جو کہ ٹھیک کروائی جا سکتی ہیں، مگر محکمہ صحت کے اہلکار ان پر کام نہیں کرتے۔

ہزاروں کی تعداد میں مریضوں کو اپنے علاج معالجے کے لیے ملتان اور بسا اوقات لاہور بھی جانا پڑتا ہے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ دوران سفر، مریض جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

سرکاری ہسپتالوں میں کام کرنے والے ڈاکٹر شام کو اپنے کلینکس بھی چلاتے ہیں اور شکایات سننے کو ملتی ہیں کہ وہ دوران ڈیوٹی سرکاری ہسپتالوں میں ٹھیک کام نہیں کرتے۔

حل

مقامی شہریوں کو چاہیے کہ اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے، بالخصوص ممبر صوبائی اسمبلی، کیونکہ صحت اب صوبائی مسئلہ ہے، پنجاب حکومت پر دباؤ بڑھائیں تاکہ خانیوال ضلع میں صحت کی سہولتوں کو بہتر سے بہتر بنایا جا سکے۔ صوبائی ممبران اسمبلی اور مقامی سطح کے سیاستدانوں کو ضلعی محکمہ صحت کے ساتھ مل کر اس کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں مقامی سیاسی قیادت اور میڈیا کا کردار بہت اہم ہے۔

سرکاری سطح کے بڑے ہسپتالوں کی تعداد میں اضافے کی ضرورت ہے جبکہ صحت کے دیہی مراکز اور ڈسپنسریوں کی تعداد کو بھی بڑھایا جانا چاہیے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ اس سلسلہ میں میڈیا اور مقامی سیاسی قیادت کو کام کرنے کی اشد ضرورت ہے اور ان کے ساتھ غیر سرکاری تنظیموں کو بھی آگے آنا چاہیے۔ اک شہری اتفاق ہی ان مسائل کو نہ صرف اجاگر کر سکتا ہے، بلکہ حل کرنے میں بھی مدد فراہم کرے گا۔

سرکاری ہسپتالوں میں موجود طبی آلات اور مشینوں کو اپ-گریڈ کیا جانا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ ناکارہ مشینوں کو فوری طور پر تبدیل کیا جائے۔ اس کام کے لیے بھی ضلعی سطح کا اک شہری اتحاد بہت ضروری ہے۔

خواتین کے لیے ٹراما اور برن سینٹرز کا قیام بھی عمل میں لانا چاہیے اور ان کے لیے الگ سے ہسپتال بھی قائم کیا جانا چاہیے۔ یہ تمام کام صرف سرکاری اداروں کی صوابدید پر نہیں چھوڑے جا سکتے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ شہری مل جل کر یہ کام اپنے حق میں حاصل کریں۔

تعلیم کے مسائل

تعلیم کے شعبے کی اگر بات کی جائے تو 29 لاکھ آبادی والے اس ضلع میں ایک بھی سرکاری یا نجی یونیورسٹی تا حال موجود نہیں۔ اور میڈیکل کالج کا تو ابھی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے گریجویٹس بلکہ شاید ہر سال سینکڑوں گریجویٹس دوسرے بڑے شہروں کا رخ کر لیتے ہیں اور پھر اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس شاذ ہی لوٹتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سے مقامی سطح کا برین-ڈرین ہو رہا ہے۔

پورے ضلع میں صرف 27 کالجز ہیں جن میں سے 16 لڑکوں اور 11 لڑکیوں کے لیے ہیں۔

گورنمنٹ کالجز تو موجود ہیں مگر اکثر تو گریجویٹ لیول تک نہیں ہیں اور کچھ پوسٹ گریجویٹ ہونے کے باوجود بہت سارے شعبوں میں ڈگری دینے سے عاری ہیں۔ وہاں اساتذہ کی مسلسل کمی رہتی ہے۔ پنجاب کے محکمہ تعلیم کے تحت یہاں ٹرانسفر ہو کر آنے والے اگر بڑے شہروں سے آئیں تو بہت جلد اپنے تبادلے واپس بڑے شہروں میں کروا لیتے ہیں۔

تعلیمی معیار پر بھی بہت شکایات ہیں۔ مزید یہ کہ فنی تعلیم کی تربیت کے اداروں کی کمی کی وجہ سے بے روزگاری کے مسائل بھی بہت زیادہ ہیں۔

اس کے علاوہ کئی اداروں کے نجی کالجز بھی موجود ہیں مگر وہاں بھی تعلیمی معیار کی شکایات عام سننے کو ملتی رہتی ہیں۔

نوجوانوں اور خواتین کے لیے پیشہ وارانہ تربیت کا کوئی نظام اور ادارہ بھی موجود نہیں۔

حل

ضلع میں فوری طور پر دو یونیورسٹیوں کی ضرورت ہے: ایک ضلعی یونیورسٹی اور دوسری زرعی یونیورسٹی۔ شہری سطح پر اس سلسلہ میں کوئی تحریک یا تحرک نظر نہیں آیا تو اس مسئلہ کو حل کرنے کی جانب کوئی پیش قدمی تب تک ممکن نہیں ہو گی جب تک مقامی عمائدین، سماجی رہنما، میڈیا اور غیر سرکاری تنظیمیں یک-زبان ہو کر اس مسئلہ پر آواز بلند نہیں کریں گی۔ اس سلسلہ میں مقامی میڈیا اور غیر سرکاری تنظیموں کو بالخصوص مل کر ایسے پلیٹ فارم تخلیق کرنے کی ضرورت ہے جو اس مسئلہ کو مسلسل اٹھائے رکھے اور ساتھ ہی ساتھ میں ممبران صوبائی اسمبلی کے ساتھ مل کر پنجاب کے محکمہ تعلیم پر دباؤ ڈال سکے تا کہ ضلع میں دو یونیورسٹیاں قائم کی جا سکیں۔

خانیوال صنعتی علاقہ تو ہے مگر یہاں خواتین کی تعلیم کے اعداد و شمار بالکل بھی حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ضلع بھر میں خواتین کی خواندگی صرف 25 فیصد ہے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ مقامی عمائدین اور شہری، میڈیا اور پبلک انٹیلیکچوئلز کے ساتھ مل کر اس مسئلہ کا حل تلاش کریں اور خواتین میں خواندگی کی شرح بڑھانے کی تسلسل کے ساتھ کوششیں کریں۔ بہت ساری خواتین جو بی-اے کے بعد کو-ایجوکیشن کی وجہ سے تعلیم جاری نہیں رکھ پاتیں، ان کی سہولت کے لیے ضروری ہے کہ خواتین کے لیے یونیورسٹی کے کیمپس الگ بنا دیئے جائیں۔

مقامی سیاسی و سماجی قیادت کو محکمہ تعلیم کے ساتھ مل کر اس بات کا لازما تدارک کرنا چاہیے کہ یہاں کی تقرری پانے والے اساتذہ، بالخصوص کالجز میں، اک مخصوص مدت تک اپنا تبادلہ نہ کروا سکیں۔ اس سے بچوں کی تعلیم کا بہت حرج ہوتا ہے۔

نوجوانوں اور خواتین کی پیشہ وارانہ قابلیت میں اضافے کے لیے نئے ادارے قائم کیے جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ موجود اداروں میں پیشہ وارانہ قابلیتیں بڑھانے کے لیے سپیشل کورسز کا آغاز کیا جائے۔ غیر سرکاری تنظیمیں اس سلسلہ میں پراجیکٹس لے کر آئیں اور مقامی میڈیا اور سیاسی قیادت ان کے لیے ضلعی انتظامیہ کے ساتھ سہولت کاری کے فرائض سرانجام دیں۔

خواتین کے مسائل

ضلع خانیوال میں خواتین پر گھریلو تشدد کے واقعات تواتر سے رپورٹ ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ انہیں ہراساں کرنے کے واقعات بھی سننے اور پڑھنے کو ملتے رہتے ہیں۔ پورے ضلع میں ایسی متاثرہ خواتین کے لیے ایک بھی ٹراما یا نفسیاتی بحالی کا مرکز موجود نہیں ہے۔

خواتین کو قانونی مسائل کا بھی سامنا ہے۔ خانگی مسائل جو عدالتوں میں چلتے ہیں، ان کی پیروی کرنے کے لیے خواتین کو مسلسل تشدد کا خوف رہتا ہے اور انہیں کوئی قانونی مدد بھی فراہم نہیں کی جاتی۔ خواتین کو خصوصی قانونی مدد فراہم کرنے کے لیے مقامی پولیس کے تھانوں میں خواتین سٹاف تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔

چھوٹی عمر کی بچیوں کی شادی کے مسائل موجود ہیں، مگر ان کی ریشو کم ہے۔ اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ اس مسئلہ پر کام کرنے کی ضرورت نہیں۔

حل

شہریوں کا خیال ہے کہ خواتین کے بارے میں بنائے گئے قوانین پر عملدرآمد بذریعہ پولیس، عدلیہ اور انتظامیہ کیا جائے اور تشدد کی شکار خواتین کے کی نفسیاتی بحالی کے لیے بھی ضلعی حکومت کوششیں کرے۔ اس کے لیے ضلعی اور تحصیل کی سطح پر ٹراما اور نفسیاتی بحالی کے مراکز قائم کیے جانے چاہئیں جن کے لیے ضلع میں موجود غیر سرکاری تنظیمیں، قومی اور بین الاقوامی امدادی اداروں کے ساتھ مل کر خواتین کے حقوق پر سماجی تربیت کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے تشدد اور ہراسگی سے متاثر خواتین کی نفسیاتی بحالی کے لیے کوششیں کریں۔

خواتین پر تشدد پر کمی یا خاتمے کے لیے اک بار پھر غیر سرکاری تنظیموں اور میڈیا کو اک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے تاکہ وہ سماجی سطح پر ضلع کے شہری اور بالخصوص دیہاتی پس منظر رکھنے والے علاقوں میں کمیونیٹیز کی سطح پر آگاہی کی مہم چلا سکیں۔

شہریوں کا خیال ہے کہ اگر خواتین کو روزگار کے لحاظ سے خود کفیل بنایا جائے تو ان پر تشدد کے واقعات میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں ضلعی حکومت کو اقدامات کرنے چاہئیں، اور مزید یہ کہ خواتین کو بالخصوص چھوٹے کاروبار کی تربیت کے لیے مقامی چیمبر آف کامرس کو اک کلیدی کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔

خواتین کے مسائل اور کم عمر بچیوں کی شادی کے چیلنجز سے نبٹنے کے لیے غیر سرکاری تنظیموں کے کردار کو مؤثر بنانے کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں مقامی خواتین رہنماؤں کے ساتھ مل کر اک انفارمل تنظیم قائم کی جانی چاہیے جو ایسے موضوعات پر مسلسل کام کرنے کی اہل ہو۔

امن وامان کا مسئلہ

مجموعی طور پر خانیوال ضلع پرامن ہے، مگر موجود امن کو مستقل بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے سماجی ہم آہنگی کے پروگرام موجود نہیں اور پولیس بھی عام طور پر مقامی طور پر موجود سماجی تنظیموں کے ساتھ اس معاملہ پر کوئی تعاون کرتی نظر نہیں آتی۔

حل

پولیس اور قانون نافذ کرنے والے دوسرے ادارے موجود سماجی اور غیر سرکاری تنظیموں سے مدد حاصل کریں اور ان کے ساتھ مل کر سماجی ہم آہنگی کے رویوں کو فروغ دینے کے لیے آگاہی پروگرام اور تربیت شروع کریں۔ ضلعی حکومت اور مقامی میڈیا کو ان کی مدد کرنی چاہیے تاکہ سماجی ہم آہنگی کے معاملات بھی معاشرتی گفتگو میں برابری کا حصہ حاصل کر سکیں۔

اسی طرح مقامی سماج میں موجود عمومی مذہبی انتہاپسندی کے خطرات سے نبٹنے کے لیے غیر سرکاری تنظیمیں، مقامی میڈیا، دانشور اور سماجی رہنماؤں کے ہمراہ مذہبی رہنماؤں کے ساتھ کام کے آغاز کریں اور ان کے ذریعے نوجوانوں کو رواداری پر مبنی مواد فراہم کیا جائے اور انہیں امن سے جڑے معاملات کی تربیت فراہم کی جائے۔

زراعت کے مسائل

ضلع خانیوال میں زراعت کے مسائل جنوبی پنجاب کے باقی اضلاع سے زیادہ مختلف نہیں۔

یہ ضلع زراعت اور فصلوں کی پیداوار کے لحاظ سے نمایاں مقام رکھتا ہے اور یہاں کی زمین کی کارکردگی مزید بہتر بنائی جا سکتی ہے اگر نہری اور زیرزمین پانی کے مسائل حل کیے جا سکیں بااثر افراد پانی کے تقسیم پر اثرانداز ہوتے ہیں جس کی وجہ سے چھوٹا کاشتکار مسلسل نقصان اور گھاٹے میں رہتا ہے۔

مقامی اور چھوٹے کاشتکاروں کو ڈیزل، پٹرول اور بجلی کی میں حکومتی رعائتیں ملنی چاہیئں اور اس سلسلہ میں محکمہ زراعت اتنا سرگرم بھی نظر نہیں آتا۔ کچھ یہی مسئلہ کھادوں کی فراہمی پر بھی ہے۔ کھادوں کے سٹاکسٹس قیمتیں مصنوعی طور پر بڑھا دیتے ہیں جس کی وجہ سے چھوٹے کسانوں پر بوجھ مزید بڑھ جاتا ہے۔

حل

ضلع میں نہری پانی کی فراہمی میں منصفانہ رویہ موجود ہونا چاہیے اور اس سلسلہ میں سرکاری ادارے کسی قسم کی سیاسی سفارشوں کو تسلیم نہ کریں۔ مقامی سماجی قیادت کو حکومتی اداروں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ چھوٹے کسان کی حق تلفی نہ ہو۔ خاص طور پر وہ چھوٹے کسان جو نہروں اور کھالوں کے Tail-Ends پر موجود ہیں۔

ضلع میں چھوٹے کسانوں کو حکومت کی جانب سے پیش کردہ رعایتوں میں سے بھرپور حصہ ملنا چاہیے اور ان کے لیے ڈیزل، پٹرول اور بجلی کی مد میں رعایتی نرخ وصول کیے جانے چاہیئں۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کا فرض ہے کہ انہیں حکومتی رعایتوں میں رکاوٹ ڈالنے والے افراد اور اداروں کے خلاف کارروائی کریں اور زرعی ادویات اور کھادوں کی فراہمی کے نظام کو بلیک مارکیٹ کی نذر ہونے سے بچایا جائے۔

ضلع کے دیہاتی علاقے کی عمومی پسماندگی کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ غیر سرکاری تنظیمیں اس معاملہ میں شاندار مدد فراہم کر سکتی ہیں۔ انہیں کوشش کرنی چاہیے کہ وہ قومی یا بین الاقوامی امدادی اداروں سے مدد حاصل کریں اور چھوٹے کاشتکاروں کے لیے پراجیکٹس شروع کریں۔

حکومتی اداروں کو چھوٹے کاشتکاروں کے لیے ٹیوب ویل کے کنکشنز میں آسانی فراہم کی ضرورت ہے۔ اکثر چھوٹے کاشتکار ناخواندہ ہونے کے سبب مختلف سرکاری معاملات میں کاغذی کارروائی پوری نہیں کر سکتے تو مقامی غیر سرکاری تنظیمیں اس سلسلہ میں یقیناً عمدہ مدد فراہم کرنے کے قابل ہو سکتی ہے۔

اجلاس کے شرکاء

سیریل نمبر	نام	ضلع
1	اطہر محمود لاشاری	بہاولپور
2	شمائلہ اکرم	بہاولپور
3	ظہور جوئیہ	ملتان
4	اسد عباس	ملتان
5	حسین رضا	ملتان
6	ناظم حسین بلوچ	مظفر گڑھ
7	خالد محمود	مظفر گڑھ
8	شہزاد شفیع	مظفر گڑھ
9	سید طالب حسین نقوی	ڈیرہ غازی خان
10	مدثر منظور لاشاری	ڈیرہ غازی خان
11	شہناز اجمل	راجن پور
12	شاہد حسین	راجن پور
13	عبد الرب فاروقی	رحیم یار خان
14	خلیل بخاری	رحیم یار خان
15	فرید اللہ چوہدری	لیہ
16	ارم ستار	لیہ
17	شاہد محمود مرزا	وہاڑی
18	صائمہ بتول	وہاڑی
19	طاہر احمد شاہ	بہاولنگر
20	شاہد علی چشتی	بہاولنگر
21	زنیرہ شفق	لودھراں
22	اعجاز خان سہو	لودھراں
23	خالد محمود	خانیوال
24	محمد تحسین	لاہور
25	ذاکر شاہین	لاہور
26	مبشر اکرم	اسلام آباد
27	عبد اللہ دایو	اسلام آباد

اشاعت:

کاپی رائٹ 2021، فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ پاکستان آفس
فرسٹ فلور، W-66، جنید پلازہ، جناح ایونیو، بلیو ایریا، پی او بکس
1289، اسلام آباد، پاکستان

ذمہ داران:
ڈاکٹر یوخن ہپلر | کنٹری ڈائریکٹر
عبداللہ دایو | پروگرام کوآرڈینیٹر

تصاویر:
کاپی رائٹ: یوخن ہپلر

فون: 4 – 3391 280 51 92+
فیکس: 2803395 51 92+
ویب سائٹ: http://www.pakistan.fes.de
فیس بک:Friedrich-Ebert-Stiftung, Pakistan
ٹویٹر: @FES_ PAK

ایف ای ایس کے زیر اہتمام شائع کردہ تمام مواد کا کمرشل بنیادوں پر
استعمال ایف ای ایس کی تحریری رضامندی کے بغیر ممنوع ہے۔

فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ (ایف ای ایس) جرمنی کی سب سے پرانی سیاسی فاؤنڈیشن ہے۔ اس کا نام جرمنی کے سب سے پہلے جمہوری منتخب صدر فریڈرک ایبرٹ کے نام پر رکھا گیا ہے۔ فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ نے پاکستان میں اپنا نمائندہ آفس 1990 میں قائم کیا۔ ایف ای ایس ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے مکالمے کو آگے بڑھانے اور اپنے بین الاقوامی کاموں میں پرامن پیش رفت پر توجہ دیتی ہے۔ دنیا بھر میں سیاست، معیشت اور معاشرے میں سماجی انصاف ہمارے معروف اصولوں میں سے ایک ہے۔ پاکستان میں ایف ای ایس غور و فکر کے عمل اور عوام کو آگاہی کے ذریعے جمہوری کلچر کے فروغ کے لیے مختلف سرگرمیوں میں مصروفِ عمل ہے، معاشی اصلاحات اور محنت کشوں کے موئثر ہونے اور امن و ترقی کے لیے حالیہ برسوں میں علاقائی تعاون کو مستحکم کرنے کے لیے سماجی انصاف کی وکالت کر رہی ہے اور اسے فروغ دے رہی ہے۔

ایف ای ایس کے زیر اہتمام شائع کردہ تمام مواد کا کمرشل بنیادوں پر استعمال ایف ای ایس کی تحریری رضامندی کے بغیر ممنوع ہے۔

ISBN: 978-969-9675-40-9